تدبّرِ قرآن

۲۳

المؤمنون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ــــ سورۂ حج ــــ کی توام اور مثنیٰ ہے۔ سورۂ حج جس مضمون پر تمام ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ سورۂ حج کے آخر میں مسلمانوں کا فریضۂ منصبی یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول نے دینِ حق کی گواہی جس طرح تم پر دی ہے اسی طرح اب تمھارا فرض ہے کہ یہ گواہی تم خلق پر دو۔ ساتھ ہی اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جن باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے مثلاً اہتمامِ نماز، ادائیگی زکوٰۃ اور توکل علی اللہ، ان کی ہدایت فرمائی ہے۔ اب اس سورہ کو پڑھیے تو بعینہٖ اسی مضمون سے اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا اسی کا تکملہ و تتمہ ہے۔ سورۂ حج کی آخری اور سورہ مومنون کی ابتدائی آیات نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مضمون کے اعتبار سے بھی دونوں سورتوں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف اسلوبِ بیان اور نہجِ استدلال کا فرق ہے۔ سورۂ حج میں اہلِ ایمان کو فوز و فلاح کی اور کفار کو ذلت و نامرادی کی جو خبر دی گئی ہے وہ اس سورہ میں پوری طرح آشکارا ہو گئی ہے۔ خاص طور پر اہلِ ایمان کے لیے بشارت کا مضمون اس میں بالکل کھل کر سامنے آ گیا ہے اور وہ اوصاف بھی وضاحت سے بیان ہو گئے ہیں جن کے ساتھ یہ بشارت مشروط ہے۔ اسی طرح کفار پر بھی یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ تمھیں جس ذلت کی خبر دی جا رہی ہے وہ لازماً پیش آ کے رہے گی، آفاق و انفس اور تاریخ کی شہادت یہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کا گھر بنایا ہے اس وجہ سے اس میں اہلِ ایمان کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور اہلِ کفر کو ڈھیل بھی دی جاتی ہے۔ لیکن یہ عارضی وقفے ہیں۔ بالآخر حق ہی کا بول بالا ہو گا اور اہلِ باطل نامراد ہوں گے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۱) اہلِ ایمان کے لیے فوز و فلاح اور جنت کی وراثت کی بشارت اور یہ بشارت جن شرائط کے ساتھ مشروط ہے ان کا بیان۔

(۱۲-۲۲) انسان کی خلقت میں خدا کی قدرت و حکمت کی جو نشانیاں ہیں ان سے موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر استدلال اور اس کائنات میں خدا کی پروردگاری کے جو آثار و شواہد ہیں ان سے جزا و سزا کے لازم ہونے پر دلیل۔

(۲۳-۵۰) حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ۔ ابتدائی انبیاء میں سے حضرت نوحؑ کا اور آخری انبیاء میں سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت مسیح علیہم السلام کا نام لے کر اور بیچ کے تمام انبیاء کا نام لیے بغیر حوالہ جس سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آج جس انداز سے خدا کے رسول کی تکذیب ہو رہی ہے اسی انداز سے ہمیشہ تشریف

اور مفسدوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے لیکن اللہ نے رسولوں کی دعوت کو فروغ دیا اور شریروں کی جڑ کاٹ دی۔ یہی اب بھی ہوگا لیکن یہ دنیا دارالامتحان ہے اس میں اہلِ حق کی آزمائش لازمی ہے۔ اس آزمائش کے تقاضے سے اہلِ باطل کو بھی ایک حدِ خاص تک مہلت دی جاتی ہے کہ وہ بھی جتنا زور لگانا ہے لگالیں۔ ان کے پاس کوئی عذر نہ باقی رہ جائے۔

(۵۱-۶۷) تمام انبیاء کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ہی دین ملا اور وہ ایک ہی دعوت کے داعی بن کر آئے لیکن ان کی امتوں نے ان کے لائے ہوئے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور اب سب اپنے اپنے طریقہ پر مگن ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر کہ ان کو ان کی سرمستی میں کچھ دن مگن رہ لینے دو۔ یہ اس مغالطہ میں ہیں کہ مال و اولاد کی جو نعمت انھیں ملی ہوئی ہے یہ ان کے خیر میں اضافہ ہے۔ یہ خیر میں اضافہ نہیں بلکہ ان کی تباہی میں اضافہ ہے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ خیر میں اضافہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کے اندر ایمان، خشیت، اخلاص اور انفاق کی صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ بے شک اپنی نیکیوں کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ رہے یہ دنیا دار اور دنیا پرست تو یہ اسی طرح اپنی دلچسپیوں میں ڈوبے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کو پکڑیں گے تو یہ اپنے سر پیٹیں گے لیکن اس وقت ان کا سارا چیخنا چلانا بے سود ہوگا۔

(۶۸-۷۷) مکذبین کے بعض شبہات و اعتراضات کا حوالہ اور ان کے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ۔ نیز ان کے مطالبۂ عذاب کا جواب کہ اگر ان کو عذاب کا کوئی نمونہ دکھا بھی دیا گیا تو یہ ان کے لیے سودمند نہ ہوگا۔ جس طرح یہ دوسروں پر گزرے ہوئے حوادث سے کوئی سبق نہیں لیتے اسی طرح اگر خود ان پر بھی کوئی آفت آئے تو اس سے چھوٹتے ہی پھر گرد جھاڑ کے اپنی بدمستیوں میں کھو جائیں گے۔

(۷۸-۹۲) معجزے اور نشانیاں مانگنے والوں کو کان، آنکھ اور دل و دماغ سے کام لینے کی دعوت کہ اگر تم خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لو تو تمھیں مرنے کے بعد اٹھنا اور جزا و سزا کا معاملہ ایک بدیہی حقیقت معلوم ہوگا۔ پھر ان کے تضادِ فکر کے بعض پہلوؤں کی نشاندہی کہ یہ لوگ خود اپنے مسلّمات کے نہایت بدیہی لوازم سے محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں گریز اختیار کر رہے ہیں۔

(۹۳-۱۱۸) خاتمۂ سورہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاندین کے رویہ سے چشم پوشی و درگزر کرنے اور آنے والے عذاب سے پناہ مانگتے رہنے کی تلقین اور کفار کو وعید کہ وہ وقت قریب ہے جب تم سر پیٹو گے اور آرزو میں کرو گے کہ کاش تمھیں دنیا میں جا کر کچھ نیکی کرنے کا موقع ملے لیکن اس وقت اس کا موقع گزر چکا ہوگا۔ اس وقت صرف وہ لوگ فلاح پائیں گے جن کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ اس وقت فائز المرام ہمارے وہی بندے ہوں گے جو آج تمھیں خدا کی راہ کی دعوت دے رہے ہیں لیکن تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو۔ آج تمھیں یہ دنیا کی زندگی بڑی طویل معلوم ہو رہی ہے لیکن اس دن اندازہ ہوگا کہ یہ زندگی چند لمحوں میں گزر گئی۔ تم نے گمان کیا کہ ہم نے تمھیں شترِ بے مہار بنا کر اس دنیا میں چھوڑا ہے اور تمھیں ہمارے پاس لوٹنا نہیں ہے لیکن تمھیں ایک ہی خدائے برتر و عظیم کی طرف لوٹنا ہوگا اور تمھارے شرکاء و شفعاء تمھارے کچھ کام نہیں آئیں گے۔

سُورَةُ الْمُؤْمِنُونَ (۲۳)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۱۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿۲﴾ آیات ۱-۱۱
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فٰعِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹﴾
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾

ترجمہ آیات ۱-۱۱

فائز المرام ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے اور جو لغویات سے احتراز کرنے والے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے حد تک سو اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو ان کے سوا کے خواہش مند ہوتے تو وہی ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی

حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے۔ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے! ۱-۱۱

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (۱)

اہل ایمان کو فلاح دنیاد آخرت کی بشارت

لفظ 'مُؤْمِنُوْنَ' ہر چند عام ہے لیکن یہاں اس کے مصداق اصل وہی اہل ایمان ہیں جو اس دور میں حق کی خاطر ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیل رہے تھے۔ فرمایا کہ وہ فائز المرام ہوئے۔ یہ بشارت ہے تو مستقبل سے متعلق لیکن اس کو تعبیر ماضی کے صیغے سے فرمایا ہے جس سے مقصود اس کی قطعیت کا اظہار ہے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بات کا فیصلہ ہو چکا تو گویا وہ بات واقع ہو چکی۔ یہاں جس فلاح کی بشارت ہے اس کا حقیقی ثمرہ تو فلاح آخرت ہے۔ وہی اصل چیز ہے اور اہل ایمان کا نصب العین ہمیشہ وہی ہوتی ہے لیکن اس کے اندر تمکن فی الارض کی وہ بشارت بھی مضمر ہے جو پچھلی سورہ میں دی گئی ہے۔ لیکن اس کا ذکر چونکہ پچھلی سورہ میں وضاحت سے ہو چکا ہے اس وجہ سے اس سورہ میں اصل انعام — فردوس — کا ذکر ہوا۔ دوسری چیزیں اس کے تحت خود بخود آ گئیں۔

اَلَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ (۲)

روح نماز کی طرف اشارہ

'خشوع' کے معنی عاجزی، تذلل، نیاز مندی اور فروتنی کے ہیں۔ یہ لفظ مختلف شکلوں میں قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ 'خشعت الاصوات' اور 'تخشع قُلُوْبُهُمْ' وغیرہ کے استعمالات سے لفظ کی اصل روح پر روشنی پڑتی ہے اس وجہ سے جن لوگوں نے اس کے معنی مجرد 'سکون' کے لیے ہیں ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ یہ اس نماز کی اصل روح کی طرف اشارہ ہے جس پر مذکورہ فلاح کا انحصار ہے۔ مطلب یہ کہ رب کے آگے آدمی کی کمر اور اس کا سر ہی نہ جھکے بلکہ اس کا دل بھی سرنگندہ ہو جائے۔ ان اہل ایمان کی کیفیت یہی ہے کہ نمازوں میں ان کے قیام، ان کی ہیئت، ان کی آواز اور ان کے رکوع و سجود ایک ایک چیز سے ان کے دل کے خشوع کی شہادت ملتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ پچھلی سورہ کی آخری آیت میں 'اقامت صلوٰۃ' کی ہدایت ہوئی تھی جو نماز کے ظاہری اہتمام و التزام کی تعبیر ہے۔ اس سورہ میں نماز کی اصل روح کا ذکر ہوا اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ یہ ان اہل ایمان کی صفت ہے جن کو فلاح کی یہ بشارت دی جا رہی ہے۔

وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ (۳)

زندگی پر نماز کا اثر

یہ زندگی پر نماز کا اثر بیان ہوا ہے۔ 'لغو' سے مراد ہر وہ قول و فعل ہے جو زندگی کے اصل مقصود —

رضائے الٰہی — سے غافل کرنے والا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مباح ہے یا غیر مباح۔ جس نماز کے اندر خشوع ہو اس کا اثر زندگی پر لازماً یہ پڑتا ہے کہ فضول، غیر ضروری، لایعنی، بے مقصد چیزوں سے آدمی احتراز کرنے لگتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اگر میں نے کوئی فضول قسم کی حرکت کی تو اپنے عالم الغیب مالک کو ایک روز منہ دکھانا ہے اور اس چیز کی شب و روز میں کم از کم پانچ بار اس کو یاد دہانی ہوتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا ضمیر اتنا بیدار اور حساس ہو کہ ہر غیر ضروری حرکت سے اس کی طبیعت انقباض محسوس کرے وہ کسی بڑی بے حیائی اور برائی کا مرتکب کبھی مشکل ہی سے ہو گا۔ نماز کا زندگی پر یہی اثر سورۂ عنکبوت میں یوں بیان ہوا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ ۴۵ (نماز بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے) روکنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ایک نہایت ہی موثر واعظ و زاجر ہے جو شب و روز میں پانچ مرتبہ انسان کو تذکیر کرتی رہتی ہے کہ دربار الٰہی کے شایان شان اعمال و کردار کیا ہیں اور انسان کو کہاں جانا ہے اور اس کے لیے اس کو کیا تیاریاں کرنی چاہئیں اور اپنے آپ کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔

آیت کا اصل مفہوم تو یہی ہے لیکن موقع کلام ایک اور ضمنی مفہوم کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مخالفین کی ان خرافات پر ایک تعریض بھی ہے جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر وقت بکتے رہتے تھے۔ یہ مفہوم سورۂ قصص کی اس آیت سے نکل رہا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا	اور جب وہ کوئی فضول بکواس سنتے ہیں تو اس سے اعراض
عَنْہُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ	کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے اعمال
لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ (قصص: ۵۵)	ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارے اعمال۔

یہی مضمون دوسرے مقام میں وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (فرقان: ۷۲) کے الفاظ سے ادا ہوا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں زیر بحث آیت سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ اللہ کے یہ بندے مخالفین کی ژاژ خائیوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے اپنے رب کے ذکر اور اس کی آیات کے فکر میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ (۴)

نماز کے بعد دین کا دوسرا ستون زکوٰۃ ہے

نماز کے بعد دین کا دوسرا ستون، جیسا کہ ہم اس کتاب میں وضاحت سے بیان کر چکے ہیں، زکوٰۃ ہے۔ سورۂ مریم اور سورۂ انبیاء میں آپ تفصیل سے پڑھ آئے ہیں کہ ہر نبی کے باب میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ کَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ (وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تعلیم دیتا تھا) اس زکوٰۃ کی قانونی شکل ہر دین میں کچھ مختلف رہی ہے لیکن انفاق فی سبیل اللہ کی تعبیر کے لیے یہ ایک جامع اور معروف لفظ ہے اور اس کی حیثیت دین میں نماز کے مثنیٰ اور اس کے مظہر اول کی ہے۔ نماز بندے کو خالق سے جوڑتی ہے اور زکوٰۃ بندے کو بندوں کے ساتھ مربوط کرتی ہے اور جو بندہ خلق اور خالق دونوں سے صحیح بنیاد پر مربوط

ہو جائے درحقیقت وہی بندہ دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا سزاوار ہے۔ اگرچہ یہ سورہ مکی ہے اور اسلام میں باقاعدہ اصطلاحی زکوٰۃ کا نظام بعد میں قائم ہوا لیکن یہ لفظ مصطلحہ شرعی زکوٰۃ کے مفہوم میں نہیں بلکہ انفاق کے مفہوم میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو مصدری معنی یعنی تزکیہ کے مفہوم میں لیا ہے، ان کی رائے ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مکی سورتوں میں بھی نماز کے ساتھ بار بار آیا ہے اور کہیں بھی اس سے مراد تزکیہ نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ ہی ہے جس کے برکات و ثمرات میں سے تزکیہ بھی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے

فلسفۂ دین کے پہلو سے نماز اور زکوٰۃ ایمان کے دو بازو ہیں اور ان دونوں کے درمیان قدر مشترک خدا کی شکر گزاری ہے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ بندے کو نماز پر ابھارتا ہے جو تمام تر شکر ہے اور یہی شکر گزاری کا جذبہ اللہ کی راہ میں انفاق اور قربانی پر ابھارتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ زکوٰۃ درحقیقت نماز ہی کا ایک مظہر اور پہلو ہے اور دونوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔

پھر نماز کی روح، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا 'خشوع اور خشیت بھی ہے' اس پہلو سے یہ ہر برائی اور بے حیائی سے، جیسا کہ سورۂ عنکبوت کے حوالہ سے اوپر واضح ہوا، روکنے والی چیز ہے۔ چنانچہ اوپر بیان ہوا کہ جن کی نمازوں میں خشوع ہوتا ہے وہ منکرات اور لغویات سے احتراز کرتے ہیں۔ اب اسی نماز کے مزید اثرات آگے بیان ہو رہے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ (۵-۷)

شہوانی خواہشات پر قابو

یعنی یہ لوگ اپنی شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ ان کو صرف وہیں آزادی دیتے ہیں جہاں اس کا حق ان کو حاصل ہے۔ یعنی بیویوں اور لونڈیوں پر[1]۔ یہ نہیں ہوتا کہ شہوات سے اندھے ہو کر بالکل سانڈ بن جائیں اور ہر حرمت پر دست اندازی اپنا حق سمجھ لیں۔ فرمایا کہ اپنے حدود کے اندر یہ چیز مباح ہے۔ اس پر کسی کو ملامت نہیں۔ یعنی کوئی اس کو تقویٰ، دینداری اور خدا ترسی کے منافی نہ سمجھے جیسا کہ راہبانہ تصورات کے تحت عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اس حد سے آگے بڑھیں گے وہ خدا کے حدود کو توڑنے والے ہیں۔ یہاں صرف ان کے جرم کا ذکر فرمایا، اس کی سزا کا ذکر نہیں فرمایا۔ سزا کا ذکر نہ کرنے میں غصہ اور نفرت کی جو شدت ہے وہ خود واضح ہے۔ ع

خموشی معنئی دارد کہ در گفتن نمی آید

یہاں اس امر کو یاد رکھیے کہ موجودہ مغربی اور مغرب زدہ سوسائٹی میں جنسی آزادی پر اگر کوئی قدغن ہے تو صرف اس صورت میں ہے جب جبر و اکراہ کی نوبت آئے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر ہر ایک کو ہر قسم کی

---

[1] غلاموں اور لونڈیوں کے مسئلہ پر ہم اس کتاب میں پیچھے بھی بحث کر چکے ہیں اور آگے سورۂ نور کی تفسیر میں بھی اس پر مفصل بحث آ رہی ہے۔

آزادی حاصل ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ (۸)

امانت اور عہود کی حفاظت

'امانات' سے مراد وہ تمام امانتیں بھی ہیں جو ہمارے رب نے قوتوں اور صلاحیتوں، فرائض اور ذمہ داریوں کی شکل میں یا انعامات، وافضال اور اموال و اولاد کی صورت میں ہمارے حوالے کی ہیں — اور وہ امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جو کسی نے ہمارے پاس محفوظ کی ہوں یا ازروئے حقوق ان کی ادائیگی کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہو۔ اسی طرح عہد میں وہ تمام عہد و میثاق بھی داخل ہیں جو ہمارے رب نے ہماری فطرت سے عالمِ غیب میں لیے ہیں یا اپنے نبیوں کے واسطہ سے، اپنی شریعت کی شکل میں، اس دنیا میں لیے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس وہ تمام عہد و میثاق بھی اس میں داخل ہیں جو ہم نے اپنی فطرت، یا انبیاء کے واسطہ سے اپنے رب سے کیے ہیں یا کسی جماعت، یا فرد سے اس دنیا میں کیے ہیں، خواہ وہ قولاً و تحریراً عمل میں آئے ہوں یا بر بنائے شائستہ سوسائٹی میں بغیر کسی تحریر و اقرار کے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے ان تمام امانات اور ان تمام عہود و مواثیق کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔ نہ اپنے رب کے معاملہ میں خائن اور غدار ہیں نہ اس کے بندوں کے ساتھ بے وفائی اور عہد شکنی کرنے والے ہیں۔

ان دو لفظوں کے اندر وہ تمام شرعی و اخلاقی، قانونی اور عرفی ذمہ داریاں آگئیں جن کا احترام ہر شریعت میں مطلوب رہا ہے۔ یہاں یہ اوپر کی باتوں کے بعد ایک جامع بات کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے اور در حقیقت اسی اجمال کی تفصیل ہے جو پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔

حکمتِ دین کا ایک نکتہ

یہاں حکمتِ دین کا یہ نکتہ نگاہ میں رہے کہ نماز ہی ان تمام امانات و عہود کی اصل محافظ ہے۔ نماز خود بھی، جیسا کہ تفسیر سورۂ بقرہ میں ہم واضح کر چکے ہیں، بندے کا اپنے رب کے ساتھ عہد و میثاق ہے جس کی تجدید ہر بندۂ مومن دن رات میں کم از کم پانچ مرتبہ کرتا رہتا ہے اور یہ ان تمام عہود و مواثیق اور امانات و فرائض کی یاد دہانی بھی ہے جن کی ذمہ داری بندے پر عاید ہوتی ہے۔ ان مسائل پر ہم اس کتاب میں بھی موزوں مقامات میں بحث کر رہے ہیں اور خاص نماز کے اسرار و حقائق پر 'حقیقت نماز' کے عنوان سے ہم نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ (۹)

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز ہی سے اہلِ ایمان کی صفات کا ذکر شروع ہوا تھا اور اسی پر آکر ختم ہوا۔ شروع میں نماز کا ذکر اس کی روح یعنی 'خشوع' کے پہلو سے ہوا اور آخر میں اس کی محافظت یعنی اس کی رکھوالی اور اس کی دیکھ بھال کے پہلو سے ہوا، اس لیے کہ وہ برکات جو نماز کی بیان ہوتی ہیں اسی صورت میں حاصل ہوتی ہیں جب اس کے اندر خشوع کی روح ہو اور اس کی برابر رکھوالی بھی ہوتی رہے۔ یہ باغِ جنت کا پودا ہے جو پوری نگہداشت کے بغیر پروان نہیں چڑھتا۔ ذرا غفلت اور ناقدری ہو جائے تو یہ بے ثمر ہو کے رہ جاتا ہے

بلکہ اس کے بالکل ہی سوکھ جانے کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی حقیقی برکات سے بہرہ مند ہونے کی آرزو ہے تو شیاطین کی تاخت سے اس کو بچائیے اور وقت کی پوری پابندی کے ساتھ آنسوؤں سے اس کو سینچتے رہیے۔ تب کچھ اندازہ ہوگا کہ رب نے اس کے اندر آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی ہے!!

یہ بات کہ نماز ہی تمام دین کی محافظ ہے قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ ہم نے دوسرے مقام میں ان تمام مثالوں کا حوالہ دیا ہے۔ یہ دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ نماز ہی سے تمام نیکیاں نشو و نما بھی پاتی ہیں اور وہی اپنے حصار میں ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اگر نماز وجود میں نہ آئے تو دوسری نیکیاں بھی وجود میں نہیں آسکتیں اور اگر نماز ہدم کردی جائے تو دین و اخلاق کا سارا چمن تاراج ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ جس نے نماز ضائع کردی تو وہ باقی دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کردے گا۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْوَٰرِثُونَ ۝ ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ (۱۰-۱۱)

فردوس کی وراثت کے اصل حقدار

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جو اپنے باپ کی کھوئی ہوئی جنت کے وارث ہوں گے اور پھر ان کو اس سے نکالے جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا، جیسا کہ آدمؑ کو پیش آیا بلکہ وہ اس میں اپنے باپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیش رہیں گے اس لیے کہ وہ اس میں اپنے دشمن شیطان کو ہمیشہ کے لیے شکست دے کر داخل ہوں گے۔ فردوس جنت کے اعلیٰ ترین مقامات میں سے ہے اور یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس دنیا میں حق کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔

۲۔ مجموعۂ آیات ۱ - ۱۱ کے مطالب کا خلاصہ

اگرچہ آیات کی وضاحت کرتے ہوئے ہم تمام ضروری باتوں کی طرف اشارہ کرتے آئے ہیں لیکن چونکہ انہی باتوں پر تمام صلاح و فلاح کا انحصار ہے اس وجہ سے مناسب ہوگا کہ ان کو از سرِ نو ذہن میں مستحضر کرلیجیے۔ یہ باتیں اپنی حکیمانہ ترتیب کے ساتھ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خدا کے ہاں تمام صلاح و فلاح کا انحصار اس ایمان پر ہے جو آدمی کے اندر ایک ملکۂ راسخہ کی حیثیت حاصل کرے۔ محض اوپری اور ظاہر دارانہ ایمان کی اس کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔

۲۔ اس ایمان کا اولین مظہر نماز ہے۔ جس ایمان سے نماز نہ پیدا ہو وہ ایک ٹھونٹھ درخت ہے جو صرف جلانے کے کام آسکتا ہے۔

۳۔ نماز کی اصل روح خشوع یعنی دل کی فروتنی ہے۔ اگر نماز اس خشوع سے خالی ہو تو اس کا زندگی پر کوئی مفید اثر نہیں پڑتا۔

۴۔ جس نماز میں خشوع کی روح موجود ہو وہ آدمی کو فواحش و منکرات اور لاطائل باتوں سے روک دیتی ہے۔ نماز میں بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس معیت کا شعور بندے کو ان تمام سفاسف سے دور رکھتا ہے جو اس کے شایانِ شان نہ ہوں۔

۵۔ ایمان کا دوسرا مظہر اور نماز کا دوسرا بازو زکوٰۃ یعنی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ احکام شریعت میں یہی دو حکم سب سے بڑے ہیں۔ انہی پر تمام شریعت کا مدار ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا ہادم دونوں کا ہادم ہے۔ مانعین زکوٰۃ کے بارے میں سیدنا ابوبکرؓ نے جو اقدام کیا وہ اسی حکمت دین پر مبنی تھا۔

۶۔ اپنے دل اور اپنے مال دونوں پر خدا کی حکمرانی تسلیم کرنے والے کبھی اپنی خواہشوں اور شہوات کی پیروی میں ایسے اندھے نہیں ہوتے کہ خدا کے حدود کو توڑ کر اس کے بندوں کے حقوق اور ناموس پر دست درازی کریں۔

۷۔ یہ لوگ تمام امانات اور عہود کا پاس کرتے ہیں خواہ ان کا تعلق خدا سے ہو یا بندوں سے۔

۸۔ یہ لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی نماز ایک شہر پناہ کی طرح ان کے پورے دین کی حفاظت کرتی ہے۔

۹۔ جو لوگ ان صفات کے حامل ہوں گے وہی خدا کی جنت کے وارث ہوں گے اور یہی اصل کامیابی ہے۔

ان تمام باتوں کی تفصیل اگلی سورہ —— سورۂ نور —— میں آئے گی جو اس سورہ کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جب انسان کا باطن ایمان کے نور سے منور ہوتا ہے تو اس سے زندگی کے ہر گوشہ میں، خواہ وہ انفرادی ہو یا خاندانی و اجتماعی، کیا نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے محروم ہو تو اندر اور باہر ہر گوشے میں کس طرح کی تاریکی پھیلتی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۲-۲۲

اوپر اہل ایمان کو جو بشارت دی گئی ہے اگرچہ وہ ایک حقیقت ہے اور اس کے اندر ایمان سے محروم منکرین قرآن کے لیے جو انذار مضمر ہے وہ بھی ایک حقیقت ہے لیکن جو لوگ سرے سے آخرت ہی کے قائل نہ ہوں، مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو نہایت مستبعد سمجھ رہے ہوں ان پر اس انذار و بشارت کا کیا اثر ہو سکتا تھا! وہ ان ساری باتوں کو محض واہمہ کی خلاقی سمجھتے اور ان کا مذاق اڑاتے۔ ان کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر آگے انفس و آفاق کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے وجود کی تشکیل جن مراحل سے گزرتی ہے اگر کوئی اسی پر غور کرے تو اس کو اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رہ جائے گا کہ جو خدا یہ سب کچھ کر سکتا ہے اس کے لیے کسی چیز کے مرکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے وجود سے باہر اس کائنات پر غور کرے تو اس کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کا خالق اس کو پیدا کر کے کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ وہ نہایت بیداری اور اہتمام، نہایت ہی انعام و اکرام اور نہایت ہی قدرت و شان کے ساتھ اس کی نگہداشت و پرورش فرما رہا ہے۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ لوگوں کو یوں ہی شتر بے مہار بنا کر چھوڑے رکھے، نیکوں کو ان کی

نیکیوں کا انعام اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دینے کے لیے ایک روزِ جزا و سزا نہ لائے! یہ دلیل سورہ حج
کی آیت ۵ میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس کے بعض پہلو
بھی نمایاں ہوئے ہیں جو وہاں مخفی رہ گئے تھے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۲۲

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ﴿١٢﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً
فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ
لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴿١٤﴾
ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ﴿١٦﴾
وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ
غَافِلِينَ ﴿١٧﴾ وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي
الْأَرْضِ ۖ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ ﴿١٨﴾ فَأَنشَأْنَا لَكُم
بِهِ جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ لَّكُمْ فِيهَا فَوَاكِهُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا (وقف لازم)
تَأْكُلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِن طُورِ سَيْنَاءَ تَنبُتُ بِالدُّهْنِ
وَصِبْغٍ لِّلْآكِلِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم
مِّمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٢١﴾
ع وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿٢٢﴾

ترجمۂ آیات ۱۲-۲۲

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں
اس کو ایک محفوظ مستقر میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک جنین کی شکل دی۔ پھر جنین
کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہڈیوں کو گوشت کا

جامہ پہنایا۔ پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف مخلوق کی شکل میں کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا! پھر تم ان سب کے بعد لازماً مرنے والے ہو، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ ۱۲-۱۶

اور ہم نے تمہارے اوپر سات تہ بہ تہ آسمان بنائے۔ اور ہم مخلوق سے بے پروا نہیں ہوئے۔ اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازہ کے ساتھ۔ پس اس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اس کو واپس لے لینے پر قادر ہیں۔ پس ہم نے اس سے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے۔ تمہارے لیے ان میں بہت سے میوے ہیں جن سے تم لذت اندوز بھی ہوتے ہو اور اپنی غذا کا سامان بھی کرتے ہو۔ اور وہ درخت بھی اگایا جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ روغن اور کھانے والوں کے لیے سالن کے ساتھ اگتا ہے۔ اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا درس آموزی کا سامان ہے۔ ہم ان چیزوں کے اندر سے، جو ان کے پیٹوں میں ہیں، تمھیں (خوش ذائقہ دودھ) پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں دوسرے بھی بہت سے فوائد ہیں۔ اور ان سے تم اپنی غذا کا سامان بھی حاصل کرتے ہو۔ اور ان پر اور کشتیوں پر سواری بھی کرتے ہو۔ ۱۷-۲۲

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (۱۲-۱۴)

انسان کا اپنا وجود خدا اور آخرت کا شاہد ہے

انسان کی خلقت کے ان تدریجی مراحل کا بیان، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سورہ حج میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی تمہید اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ، سے اٹھائی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

مقصود اس کے بیان سے زندگی بعد الموت کا اثبات ہے۔ نیز وہاں اثنائے کلام میں 'لِنُبَيِّنَ لَكُمْ' کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جو اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ انسان کی خلقت کے لیے اللہ تعالیٰ نے تدریج و ترقی کا یہ اہتمام اس لیے فرمایا کہ ہر انسان کا اپنا وجود خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کی پروردگاری کا ایسا نشان ہو کہ آخرت کے باب میں اس کو کسی خارجی دلیل کی ضرورت باقی نہ رہے۔ سورۂ حج میں اس آیت کے الفاظ کی بھی تحقیق گزر چکی ہے اور اس کا مدعا بھی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک انسان کی خلقت کا تعلق ہے یہ تمام مراحل بالکل معلوم و معروف ہیں۔ جدید سائنس نے اس کے بعض ایسے گوشے بھی بے نقاب کر دیے ہیں جن کی طرف قرآن نے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا تھا کہ انسان کے علم میں جتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا اتنے ہی اس کے اسرار کھلتے جائیں گے۔ اس نوع کی بعض باتوں کی طرف ہم پیچھے اس کتاب میں اشارہ کر آئے ہیں۔ غرض یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ مٹی کے جوہر سے وجود میں آنے والی پانی کی ایک بوند ہے جس کو قدرت پرورش کر کے درجہ بدرجہ اس طرح پروان چڑھاتی ہے کہ بالآخر وہ سقراط و بقراط اور ارسطو و جالینوس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے؟ کیا یہ ساری تدریج و تکمیل اور ساری تربیت و نگہداشت محض اندھے بہرے مادے کی کارفرمائی ہے؟ کیا یہ تمام قدرت، و حکمت، اور تمام ربوبیت و رافت بالکل بے مقصد و غایت ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی نتیجہ اور انجام نہیں ہے؟ کیا جو پانی کی ایک بوند کو، آدمی بنا سکتا ہے، وہ اس آدمی کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا؟ یہی سوالات ہیں جن کے جواب میں نادانوں نے، اگرچہ وہ فلسفی اور سائنسدان کے معزز ناموں ہی سے موسوم ہوں، اختلاف کیا ہے۔ قرآن نے انہی سوالوں کے جواب کے لیے انسان کو خود اس کے وجود کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کے جواب کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اپنے وجود کے مراحل پر غور کرو، ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔

'ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ' میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کہاں پانی کی ایک بوند اور کہاں ایک بھلا چنگا، عاقل و بالغ انسان، دونوں میں کیا نسبت ہے! لیکن ہر انسان کے وجود میں قدرت کا یہ کرشمہ موجود ہے تو جس قدرت کا یہ کرشمہ ہر وجود میں مشاہدہ کرتے ہو اس سے یہ کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے! کیا وہ کام اس سے زیادہ مشکل ہے!

'فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ' یہ وہ تاثر اور نتیجہ بیان ہوا ہے جو انسان کی خلقت کے ان تمام مراحل پر غور کرنے والے کے سامنے آنا چاہیے کہ اللہ جس نے ایک ایک وجود کے اندر اپنی یہ شانیں اور حکمتیں اور یہ عنایتیں اور برکتیں ظاہر فرمائی ہیں، بڑی ہی بابرکت اور بافیض ہستی ہے کہ اس نے ذلیل پانی کی ایک بوند کو رحم مادر کے صدف میں پرورش کر کے ایک گوہر آبدار بنا کر نکالا اور اس کے اندر ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں کہ وہ فرشتوں کا مسجود اور زمین میں خدا کی خلافت کا اہل ٹھہرا۔ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں پر غور کرنے سے آدمی کے اندر صرف خدا کا اقرار ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے بے پایاں فیض وجود والی ہستی اور اس کے نہایت حکیم و قدیر

اور نہایت اعلیٰ و برتر خالق ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ یہاں عربی زبان کے اس اسلوب کو بھی یاد رکھیے کہ 'اَفْعَلُ' کا صیغہ بالخصوص جب کہ وہ جمع کی طرف مضاف ہو بسا اوقات تفضیل و ترجیح کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض اعلیٰ مرتبہ صفت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے 'اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ' کے معنی ہوں گے کہ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ بہترین خالق ہے۔ اس نے انسان کو جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت اور بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس اسلوب سے ناواقفیت کے باعث لفظ 'خالق' کا مفہوم بدل دیا ہے حالانکہ اس قسم کے کسی تصرف کی ضرورت نہیں ہے۔ مقصود یہاں یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان کی خلقت خود اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کسی اندھے بہرے مادے، یا کسی محرک اول یا علۃ العلل کی ایجاد نہیں ہے اور نہ اس کا ارتقاء آپ سے آپ ہوا یا ہو رہا ہے بلکہ وہ سراپا خیر و برکت ہستی خدائے جلاد و کریم کا پیدا کیا ہوا ہے جو بہترین خالق ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَیِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (۱۵-۱۶)

یہ وہ اصل نتیجہ ہے جس کو سامنے لانے ہی کے لیے اوپر کے تمام مراحل خلقت بیان ہوئے ہیں کہ ان مراحل سے گزرنے کے بعد لازماً ایک دن آتا ہے کہ تم مرتے ہو اور کسی کے لیے بھی اس موت سے مفر نہیں ہے۔ پھر قیامت کا دن آئے گا اور اس دن تم لازماً اٹھائے جاؤ گے۔ اس اٹھائے جانے کو مستبعد سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جس خدا کی یہ شانیں تم خود اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کرتے ہو اس کے لیے تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے!

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِیْنَ (۱۷)

'طرائق' کا مفہوم

'طَرَآئِقُ'، 'طَرِیْقَةٌ' کی جمع ہے۔ 'طرائق'، 'استۃ' یعنی دھاریوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں صفت اول کو موصوف کو مراد لیا ہے جو عربی زبان میں معروف ہے۔ یعنی دھاریوں والے سات آسمان۔ یہاں اس لفظ سے آسمان کی رنگا رنگی و بوقلمونی کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے۔ اور اس بارش کی طرف بھی جس کا ذکر آگے نہایت اہتمام سے آ رہا ہے۔

'وَمَا كُنَّا' یہاں بیانِ شان کے لیے ہے جس طرح 'كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا' میں ہے۔ یعنی ہم اپنی مخلوق کو پیدا کر کے اس سے غافل نہیں ہو بیٹھے بلکہ برابر نہایت اہتمام کے ساتھ اس کی پرورش اور دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

اہتمام ربوبیت کیوں ہے؟

اوپر کی آیات میں انسان کی خلقت کا بیان ہوا اور مقصود امکان معاد کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اب یہ ربوبیت کے اہتمام و انتظام کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس کے خیر و شر سے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ وہ برابر اس کی پرورش و پرداخت فرما رہا ہے۔ اس نے رنگا رنگ سات آسمان بنائے اور وہ آسمان سے پانی برساتا اور اپنی مخلوق کی پرورش کا برابر سامان کر رہا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ (۱۸)

پانی ہی سے تمام زمین کی زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل فرماتا ہے اور یہ اس کی رحمت و ربوبیت ہی ہے کہ وہ اس کو ایک خاص اندازہ اور مقدار کے ساتھ اتارتا ہے ورنہ اگر وہ اس کے دہانے ایک مرتبہ کھول دے

تو کوئی اس کو بند کرنے پر قادر نہیں اور یہی پانی رحمت و برکت ہونے کے بجائے طوفانِ نوح کی طرح عذاب و نقمت بن جائے۔ پھر یہ اس کی رحمت و ربوبیت ہی ہے کہ وہ اس پانی کو زمین میں ٹکا دیتا ہے، جو ایک ذخیرے اور محفوظ خزانے کی طرح تمام مخلوقات کے کام آتا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو وہ اس سارے پانی کو غائب کر دیتا، اس کی ایک بوند بھی اس زمین میں نہ ٹک سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی ارادہ ہے جو آسمانوں اور زمین دونوں میں کارفرما ہے۔ اگر ان میں الگ الگ ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان کے کارفرماؤں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق ناپ تول کر پانی برساتے اور اس کی بھی فکر رکھتے کہ پانی کا ذخیرہ زمین میں ضرورت کے اوقات کے لیے محفوظ بھی رہے۔ پھر یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس ذاتِ واحد کے ارادے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے وہ نہایت مہربان و کریم ہستی ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ اس دنیا کی پرورش کر رہی ہے۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۱۹)

'تَاْكُلُوْنَ' کا قرینہ دلیل ہے کہ 'فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ' کے بعد 'تَتَفَكَّهُوْنَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف مانا جائے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یعنی اسی پانی سے اللہ نے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے جن میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جن سے تم لذت اندوز ہوتے اور انہی باغوں سے تم اپنے لیے غذائی اجناس بھی حاصل کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے صرف زندہ رہنے کا سامان ہی نہیں پیدا کیا بلکہ تمہارے کام و دہن کی ضیافت کا سامان بھی مہیا فرمایا۔ جینے کو تو انسان صرف روٹی سے بھی جی سکتا ہے لیکن ربِ کریم نے تمہارے آگے قسم قسم کے میوے اور پھل بھی چن دیے۔ اہلِ عرب کے ہاں ایک اچھے باغ کا تصور، جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۳۲ میں مذکور ہے، یہ ہے کہ انگوروں کا باغ ہو، اس کے کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو اور بیچ بیچ میں مختلف اجناس اور دوسرے موسمی پھلوں کے قطعات ہوں۔ ان کے ہاں اصل پھل کی حیثیت تو کھجور اور انگور ہی کو حاصل تھی لیکن دوسرے پھل اور بعض غذائی اجناس بھی پیدا ہوتیں۔ انہی کی طرف 'فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ' اور 'مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۰)

'شَجَرَةً' سے مراد زیتون کے درخت ہیں۔ اگرچہ اس کا نام نہیں لیا ہے لیکن جو صفات اس کی بیان فرمائی ہیں وہ خود پتہ دے رہی ہیں کہ اس سے مراد زیتون ہی ہے۔ طورِ سینا اس کی پیداوار کا خاص علاقہ تھا۔ اس کا روغن اہلِ عرب میں بہت مقبول تھا اور اہلِ کتاب کے ہاں تو اس کو صرف غذائی روغن ہی کا نہیں بلکہ ایک قسم کے مذہبی تقدس کا بھی درجہ حاصل تھا۔ 'صِبْغٌ' کے معنی سالن کے ہیں۔ یہ مکھن کی طرح ایک لذیذ اور مقوی سالن بھی تھا۔ یہاں اس کی تنکیر اس کی خوبی پر دلیل ہے۔ یعنی 'صِبْغٍ طَيِّبٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ'، کھانے والوں کے لیے

ایک اچھا سالن۔ یہ اس کے دوسرے فوائد کے ساتھ اس کی ایک مزید خوبی کا بیان ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۲۱)

چوپایوں کے اندر سبق

'عِبْرَۃٌ' کے معنی، جیسا کہ آل عمران ۱۳ کے تحت واضح ہو چکا ہے، ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا اور اس سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر جو چیزیں مذکور ہوئیں ان میں جو درس عبرت و موعظت ہے وہ تو ہے ہی۔ اگر تم غور کرو تو تمھارے لیے تمھارے چوپایوں کے اندر بھی بڑا سبق موجود ہے۔

'نُسْقِيكُمْ' کا دوسرا مفعول یہاں ظاہر نہیں فرمایا ہے۔ دوسری جگہ اس کو 'لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ' (نحل: ۶۶) کے الفاظ سے ظاہر فرما دیا ہے۔ اسی طرح 'مِمَّا فِي بُطُونِهَا' یہاں مجمل ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت 'مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ' (نحل: ۶۶) کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اگر ان محذوفات کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ ہم ان چوپایوں کے پیٹ کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو بالکل بے آمیز اور خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

'وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ'۔ ان کے خاص فائدے کے ساتھ ساتھ یہ ان کے دوسرے فوائد و منافع کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ ان کا دودھ ہی نہیں بلکہ ان کی ایک ایک چیز تمھارے لیے نفع رساں ہے۔ یہ تمھاری سواری اور بار برداری کے کام آتے ہیں، تمھاری کاشت کاری میں یہ معین ہیں، ان کا گوشت، چمڑا اور ان کی اون ہر چیز تمھارے لیے کار آمد ہے۔ یہاں تک کہ ان کا گوبر بھی تمھارے کھیتوں کے لیے کھاد کا کام دیتا ہے اور یہ تمھارے لیے غذائی ذخیرہ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ تم ان کا تر و تازہ گوشت بھی کھاتے ہو اور ان کا گوشت خشک کر کے اپنی سفری ضروریات کے لیے بھی محفوظ کر لیتے ہو اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کی اصلی اہمیت ان کے غذائی پہلو ہی سے ہے۔

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ (۲۲)

'تُحْمَلُونَ' کے اندر سواری اور باربرداری دونوں چیزیں شامل ہیں اور اہل عرب کی زندگی چونکہ عام طور پر خانہ بدوشی کی تھی، موسموں کے ساتھ برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے، اس وجہ سے، ان کے لیے یہ دونوں ہی مسئلے بڑی اہمیت رکھنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ضرورت کے لیے اونٹ پیدا کیا جو ان کے صحرا کا سفینہ ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر اور کشتی کا ذکر ساتھ ساتھ فرمایا کہ ہم نے تمھارے صحرا کے لیے بھی کشتی کا انتظام کیا اور سمندر کے لیے بھی۔

اصل حقیقت کی طرف اشارہ

یہاں اصل حقیقت پر نگاہ رہے کہ مقصود ان چیزوں کے ذکر سے درس عبرت ہے کہ کیا جس رب نے ہماری ایک ایک ضرورت کا اس معجز رسی کے ساتھ اہتمام فرمایا ہے اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہم کو پیدا کر کے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے؟ کیا اس کی یہ ربوبیت ہمارے اوپر کوئی حق اور ذمہ داری

عاید نہیں کرتی ؟ اور کیا اس کا لازمی تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان ذمہ داریوں سے متعلق ہم سے پرسش ہو، جنھوں نے ان کا حق ادا کیا ہو وہ انعام پائیں، جنھوں نے اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر ساری زندگی بطالت میں گزاری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں! ظاہر ہے کہ عقل و فطرت کی شہادت اسی دوسرے پہلو کے حق میں ہے۔ جو لوگ کریم کے دروازے سے سب کچھ پا کر اس کا حق نہیں پہچانتے یا اس کے ماسوا دوسروں کے گن گاتے ہیں وہ لئیم اور ناشکرے ہیں اور لازم ہے کہ وہ اپنی اس ناشکری کا انجام دیکھیں۔

۵- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۳-۵۰

آگے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مکذبین کی تاریخ کا اجمالی حوالہ ہے اور مقصود اس سے تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت کو واضح کرنا ہے جو بیان زیر بحث ہے۔ یعنی اہلِ ایمان کی فلاح اور حق کی تکذیب کرنے والو[illegible] اسی ضمن میں اس سنتِ الٰہی کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا انجام [illegible] ہے تو بہر حال ابدی خسران لیکن اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اہلِ حق کی بھی آزمائش کرتا ہے۔ اس آزمائش کے تقاضے سے اہلِ باطل کو بھی کچھ عرصہ ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ اس ڈھیل کو اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ چیز ان کی کامیابی نہیں بلکہ ان کے لیے موت کا پھندا بنتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کے مکذبین کا حوالہ پچھلی سورہ کی آیات ۴۲-۵۴ میں بھی گزر چکا ہے لیکن بہت اجمال کے ساتھ۔ اس میں فی الجملہ تفصیل ہے لیکن نام کے ساتھ ذکر انبیائے اولین میں سے صرف حضرت نوحؑ کا اور آخری انبیاء میں سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت مسیح علیہم السلام کا ہے۔ بقیہ انبیاء کا نام لیے بغیر صرف ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ آیات
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ ۲۳-۵۰
كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ
عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗئِكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ
اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ
حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَيْنَآ
اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا

وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا
مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ
اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ
فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٨﴾ وَقُلْ
رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ
قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٣١﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ ع ١٠ ٢
مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ
مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ
اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٣٤﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ
تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا
تُوْعَدُوْنَ ﴿٣٦﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا
نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٣٨﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٣٩﴾
قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿٤٠﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤١﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا

مِنۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٤٢﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿٤٣﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۗ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً
رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ
فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٤٤﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ
بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٥﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ
كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿٤٦﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا
لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿٤٧﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿٤٨﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ
اُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿٥٠﴾ ع ٣ ١٨ ٣

تدبر آیات ٢٣-٥٠

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تو کیا تم اس کے غضب سے ڈرتے نہیں! تو اس کی قوم کے اعیان نے، جنھوں نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے، تم پر اپنی برتری جمانا چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتا۔ اس طرح کی بات ہم نے اپنے اگلے بزرگوں میں تو سنی نہیں! یہ تو بس ایک ایسا شخص ہے جس کو ایک قسم کا جنون ہے۔ تو کچھ دن اس کے باب میں انتظار کرو! ٢٣-٢٥

تو اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! تو اس چیز سے میری مدد کر جس میں انھوں نے مجھ کو جھٹلایا۔ تو ہم نے اس کو وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بنا

تو جب ہمارا عذاب آجائے اور طوفان اُمڈ پڑے تو اس میں ہر چیز کے جوڑے رکھ لو اور اپنے لوگوں کو بھی سوار کرالو بجز ان کے جن کے بارے میں قول فیصل ہو چکا ہے اور مجھ سے ان لوگوں کے باب میں کچھ نہ کہیو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے! وہ لازماً غرق ہو کے رہیں گے! ۲۶-۲۷

پس جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں سوار ہو لیں تو شکر ادا کیجیو کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی اور دعا کیجیو کہ اے رب تو مجھے اتار مبارک اتارنا اور تو بہترین اتارنے والا ہے۔ بے شک اس سرگزشت میں بڑی نشانیاں ہیں! اور بے شک ہم امتحان کرنے والے ہیں! ۲۸-۳۰

پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھائے اور ان میں بھی ایک رسول انہی میں سے اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں تو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں! اور اس کی قوم کے اعیان نے، جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا اور ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں رفاہیت دے رکھی تھی، کہا کہ یہ تو بس تمھارے ہی مانند ایک بشر ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی بات مان لی تو تم بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے! کیا وہ تمھیں اس بات کا ڈراوا دیتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم پھر نکالے جاؤ گے! بہت ہی بعید اور نہایت ہی مستبعد ہے یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے! زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ تو ایک ایسا شخص ہے جس نے خدا پر ایک جھوٹ گھڑھا ہے اور ہم اس کو ہرگز ماننے والے نہیں۔ ۳۱-۳۸

اس نے دعا کی اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس چیز سے جس میں انھوں نے مجھے جھٹلایا۔ ارشاد ہوا، بہت جلد وہ پشیمان ہو کر رہیں گے۔ تو ان کو ایک سخت ڈانٹ نے شُدنی کے ساتھ آدبوچا۔ تو ہم نے ان کو خس و خاشاک کر دیا۔ تو خدا کی پھٹکار ہو ایسے بدبختوں پر! ۳۹-۴۱

پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں اٹھائیں۔ نہ کوئی قوم اپنی اجلِ معیّن سے پہل ہی کرتی اور نہ وہ اس سے پیچھے ہی ہٹتی ہے۔ پھر ہم نے اپنے رسول بھیجے مسلسل۔ جب جب آیا کسی قوم کے پاس اس کا رسول تو انھوں نے اس کو جھٹلایا تو ہم نے بھی ایک کے پیچھے دوسری کو لگا دیا اور ان کو افسانہ بنا دیا۔ تو خدا کی پھٹکار ہو ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے! ۴۲-۴۴

پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور ایک واضح حجّت کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ نہایت مغرور لوگ تھے۔ انھوں نے کہا کیا ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات مان لیں درآنحالیکہ ان کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے! تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا اور وہ بالآخر ہلاک ہو کے رہے۔ اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عنایت کی تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔ ۴۵-۴۹

اور ہم نے ابنِ مریم اور اس کی ماں کو ایک عظیم نشانی بنایا اور ان کو ایک سکون اور چشمے والے ٹیلہ پر پناہ دی! ۵۰

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳)

ایک حسین گریز — یہاں ایک نہایت ہی حسین و بلیغ تخلیص ہے جس کو ہماری شاعری کی اصطلاح میں گریز کہتے ہیں۔ اوپر ربوبیت کے شواہد سے جزا و سزا پر جو استدلال کیا ہے وہ "وَعَلَیْهَا وَعَلَی الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ" (اور تم ان چوپایوں اور کشتیوں پر سوار کیے جاتے ہو) پر ختم ہوا ہے۔ اب آگے جب تاریخی شواہد کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے

پہلے حضرت نوحؑ کے واقعہ کو لیا جو تاریخی تقدم کے اعتبار سے بھی رسولوں کی سرگزشت کا سرنامہ ہے اور خاص طور پر کشتی ہی کو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی نجات کا اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا۔ کشتی کے ذکر کے بعد اس کشتی والے واقعہ کا ذکر اس طرح آگیا ہے گویا بات میں سے بات پیدا ہوگئی ہے۔

حضرت نوحؑ کی سرگزشت ایک خاص پہلو سے

تورات اور قرآن دونوں میں رسولوں کی تاریخ کا آغاز حضرت نوحؑ ہی سے ہوتا ہے۔ آپ کی سرگزشت کے مختلف پہلو پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں جس مقصد سے یہ سرگزشت بیان ہو رہی ہے وہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق ہو بیٹھا ہے وہ خدا کو بالکل غلط سمجھے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اس کی مادی پرورش کا بھی انتظام فرمایا ہے اور اس کی روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے اپنے رسول بھی بھیجے۔ جن لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی خدا نے اتمامِ حجت کے بعد، ان کو ہلاک کر دیا اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کو نجات و فلاح بخشی۔ اس دنیا کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بالآخر وہ ایک ایسا دن بھی لائے گا جس میں وہ نیکوکاروں اور بدکاروں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

'اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' کے بعد اس کا مفعول محذوف ہے۔ یعنی کیا تم لوگ خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے نہیں کہ اس کی خدائی میں دوسروں کو شریک کر کے ان کی بندگی کرتے ہو۔ یہ تو کھلی ہوئی بغاوت ہے جس پر ہر لحظہ تم اس کے عذاب کے سزاوار ہو۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۴)

قوم کے لیڈروں کی دعوتِ حضرت نوحؑ کی مخالفت

'مَلَأ' سے مراد، جیسا کہ ہم بقرہ ۲۴۶ کے تحت وضاحت کر چکے ہیں، قوم کے اعیان، سردار اور لیڈر ہیں۔ دعوتِ حق کی مخالفت میں پیش پیش ہمیشہ یہی ہوتے ہیں اس لیے کہ اپنے وقت کے نظامِ باطل کے سربراہ ہونے کے سبب سے رسول کی کامیابی میں وہ اپنی موت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ رسول کی دعوت سلیم الفطرت لوگوں پر اثر انداز ہو رہی ہے تو وہ اس کے اثر کو مٹانے کے لیے طرح طرح کی سخن سازیاں کرتے اور اپنے عوام کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اس کی نیت و صداقت پر حملہ کرتے ہیں کہ اس شخص کا یہ دعویٰ کہ یہ خدا کا فرستادہ ہے محض جھوٹ اور افترا ہے! یہ جھوٹ محض اس لیے اس نے گھڑا ہے کہ تمھارے اوپر اپنے خدائی فرستادہ ہونے کی دھونس جما کر تمھارا لیڈر بن جائے۔ 'يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ' کی بلاغت پر نگاہ رہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہماری لیڈری چھیننا چاہتا ہے بلکہ یہ کہا کہ تم پر اپنی سیادت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس زہر آلود فقرے میں سادہ لوح عوام کو بھڑکانے کے لیے جو مواد موجود ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے۔

مخالفت کے لیے بہانہ

'وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً' یہ رسول کی تکذیب کے لیے ان لال بجھکڑوں کی عقلی دلیل مذکور ہوئی ہے کہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اول تو ہماری رہنمائی کے لیے کسی نبی اور

رسول کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم خود اپنی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، اور اگر بالفرض خدا کسی کو نبی اور رسول بنا کر بھیجنے والا ہی ہوتا تو فرشتوں کو اس کارِ خاص کے لیے منتخب کرتا۔ آخر ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو نبی و رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی!

'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ' یعنی مزید ستم یہ ہے کہ یہ شخص جو کچھ پیش کرتا ہے تمام تر بدعت ضلالت اور باپ دادا کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے اسلاف کی روایات میں کبھی نہیں سنیں۔ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۶۸ میں یوں بیان ہوا ہے۔ 'اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ' (کیا انھوں نے کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس ایسی چیز آئی جو ان کے اگلے آبا و اجداد کے پاس نہیں آئی) سورۂ قصص میں ہے۔ 'مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ ۳۶' (یہ محض ایک جادو ہے جس کو جھوٹ موٹ خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اور اس طرح کی باتیں ہم نے اگلوں میں تو کبھی سنی نہیں) یہی مضمون دوسرے مقام میں اس طرح ہے۔ 'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ (ص: ۷)'

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ ۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ (۲۵)

رسول پر خللِ دماغ کا الزام

یعنی ان لیڈروں نے اپنے عوام کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس خدا کی طرف سے کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا ہے تو اس سے اس کے رعب میں نہ آؤ۔ یہ محض ایک قسم کا خللِ دماغ ہے جس کے سبب سے اس کو ایک قسم کا وسوسہ لاحق ہوتا ہے جس کو یہ آسمانی وحی سمجھ بیٹھتا ہے۔ 'فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ' یعنی اس شخص کی ان باتوں کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ مستقبل کے جن عذابوں سے تم کو ڈرا رہا ہے اس سے کسی اندیشہ میں مبتلا نہ ہو۔ یہ سب اس کے وساوس ہیں۔ بہت جلد یہ ہوا میں اڑ جائیں گے۔ بالکل اسی قسم کی بات قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہی جس کا حوالہ سورۂ طور میں دیا گیا ہے۔ 'اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ۔ ۳۰' (کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردشِ روزگار کے منتظر ہیں) قریش کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ان کے ساحرانہ کلام سے مسحور ہو کر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ ان کی باتوں کی کوئی بنیاد ہے اور اب مستقبل کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی اور چند روز کی گرماگرمی ہے۔ بہت جلد یہ ختم ہو جائے گی۔ جس طرح ہمارے بہت سے شاعر اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے اسی طرح ایک دن یہ بھی اڑ جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ وقت کے لیڈر جب کسی شخص کے بارے میں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ عوام اسے مستقبل کے ہادی یا نجات دہندہ کی حیثیت سے قبول کر رہے ہیں تو اس سے وہ بہت اندیشہ ناک ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ اپنے پیروؤں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا یہ سارا طلسم چند روزہ ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ (۲۶)

وعدۂ عذاب کے ظہور کے لیے حضرت نوحؑ کی دعا

یعنی جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا، حضرت نوحؑ نے یہ دعا کی کہ اے رب! اب، تو میرے اور میری قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے اور اس وعدۂ عذاب کو پورا کر کے میری مدد فرما جس سے میں نے ان کو شب و روز ڈرایا لیکن انھوں نے میری سُنی ان سُنی کر دی اور اس عذاب کے بارے میں مجھے جھٹلا دیا۔ حضرت نوحؑ کی اس دعا کا ذکر، تفصیل کے ساتھ سورۂ نوحؑ میں آئے گا۔ یہاں اس دعا کے معاً بعد، آگے والی آیت میں، حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے اور عذاب سے بچنے کے لیے تیاریوں کی ہدایت ہوئی جو اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی یہ دعا اسی وعدۂ عذاب کے ظہور کے لیے تھی۔ آگے اسی سلسلہ میں دوسرے انبیاءؑ کی زبانی بھی یہی دعا منقول ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِينَ ه فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ (ارشاد ہوا کہ بہت جلد یہ اپنی کرتوت پر پچھتائیں گے تو خدا کی ڈانٹ نے ان کو آ دبوچا) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کی کشمکش میں آخری مرحلہ ہمیشہ یہی پیش آیا ہے کہ جس عذاب سے انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا قوم کے سرکشوں نے اسی عذاب کا مطالبہ کیا اور جب اللہ تعالیٰ کی سنتِ امہال کے تحت اس میں تاخیر ہوئی تو مکذبین نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ چونکہ تم وہ عذاب نہیں لا سکے جس کی دھمکی رات دن سنا رہے ہو اس وجہ سے تم بھی جھوٹے ہو اور یہ عذاب کی دھمکی بھی جھوٹی ہے۔ یہی مرحلہ ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے دعا فرمائی ہے کہ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ (اعراف: ۸۹) (اے ہمارے رب! اب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے) اسی مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے بھی یہ دعا فرمائی ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر واضح کیا۔ صاحبِ کشاف نے آیت کا یہ مطلب لیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں 'انصرني بانجاز ما وعدتهم من العذاب وهو ما كذبوك فيه' یعنی اے رب تو اس وعدۂ عذاب کو پورا کر کے میری مدد فرما جس سے تو نے ان کو ڈرایا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے بارے میں ان کی قوم کے لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ فَاسْلُكْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ (۲۷)

بعض اجمالات کی وضاحت

یہ آیت بلکہ حضرت نوحؑ کی پوری سرگزشت سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارات پر کفایت کریں گے۔ کسی چیز کی تفصیل مطلوب ہو تو وہاں دیکھ لیجیے۔ 'بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا' یعنی یہ کشتی ہمارے اہتمام اور ہماری ہدایات کے مطابق بناؤ۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا نقشہ، اس کی جزئیات کی تفصیل کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سے حضرت نوحؑ کو بتایا تاکہ یہ اس عظیم مہم کے لیے بالکل موزوں ہو جو پیشِ نظر تھی۔ 'امر' سے مراد حکم عذاب ہے۔ 'فَارَ التَّنُّورُ' اسی طرح کا ایک محاورہ ہے جس طرح 'حمي الوطيس' وغیرہ محاورات ہیں۔ ان محاورات کا مفہوم متعین کرنے میں الفاظ کا لحاظ نہیں

بلکہ صرف اس مفہوم کا لحاظ ہوتا ہے جس کے لیے یہ استعمال ہوتے ہیں۔ 'فَارَ التَّنُّوْرُ' طوفان کے امڈ پڑنے اور جوش مارنے کی ایک تعبیر ہے۔ 'مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ' میں لفظ 'کل' جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں، معہود ذہنی کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ان جانوروں میں سے جو براہ راست انسان کی معاشی ضرورت سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ 'اثنین' زوجین کی وضاحت کے طور پر ہے یعنی ہر چیز میں سے نر و مادہ بس دو دو رکھ لیے جائیں، اس سے زیادہ رکھنے کی فکر نہ کی جائے۔ لفظ 'اھل' کی تشریح سورۂ انبیاء میں ہم کر چکے ہیں کہ اس میں آدمی کے اہل و عیال کے ساتھ اس کے اتباع و اصحاب بھی شامل ہوتے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت نوحؑ پر ان کی قوم کے کچھ لوگ ایمان لائے، اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔ 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے اتمامِ حجت کے بعد اب سنتِ الٰہی کے بموجب ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔ ان میں سب سے نمایاں، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، خود حضرت نوحؑ کا بیٹا تھا۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس کشتی میں تمھارے ساتھ نہ ہوں گے۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' میں 'ظلموا' سے مراد 'ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ' ہے۔ یعنی جنھوں نے تمھاری تکذیب پر اصرار کر کے خود اپنی شامت کو دعوت دی۔ فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ جب قہرِ الٰہی کی موجیں ان ظالموں کو اپنے گھیرے میں لے لیں تو تمھارے اندر ان کے لیے رافت کا جذبہ ابھرے اور تم ہم سے ان کی نجات کی دعا کرنی شروع کر دو۔ عذاب آ جانے کے بعد یہ مرحلہ گزر جائے گا۔ پھر ان کے باب میں تمھاری بھی کوئی شنوائی نہیں ہونی ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک لازماً غرق ہو کے رہے گا۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ الاٰية' کا یہ پہلو خاص طور پر نگاہ میں رہے کہ جب عذابِ الٰہی آ دھمکتا ہے تو اس کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے اندر بھی معذبین کے لیے جذبۂ رافت ابھرنے کا امکان ہوتا ہے جن کی حمایت و نصرت ہی کے لیے وہ ظہور میں آتا ہے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی دعا اور سفارش بھی کچھ کام نہیں آتی۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (۲۸-۲۹)

حضرت نوحؑ کی ہجرت اور ہجرت کے مناسب دعا

حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کا کشتی پر سوار ہونا اپنی قوم سے اسی طرح کی ہجرت تھی جس طرح کی ہجرت دوسرے رسولوں کو کرنی پڑی اس وجہ سے ان کو ہجرت کے مناسبِ حال دعا تلقین کی گئی کہ سوار ہو چکنے کے بعد یہ دعا کرنا کہ اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ظالموں سے ہمیں نجات دی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرنا کہ اے رب تو ہمیں جہاں اتارے خیر و برکت اور اپنے فضل و رحمت کے ساتھ اتار۔ تو بہترین اتارنے والا ہے۔ ہجرت کے موقع پر اسی مضمون کی دعائیں دوسرے انبیاءؑ سے بھی منقول ہیں۔ ہمارے حضورؐ نے بھی ہجرت کے وقت اسی طرح کی دعا فرمائی تھی۔ رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا۔ یہ دعا چونکہ اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی ہے اس وجہ سے دعا کے پیرایہ میں مستقبل

کی فوز و فلاح کی بشارت بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے رب نے تمھیں ناپاکوں اور ناہنجاروں کے ماحول سے نجات دی، اب وہ تمھیں بہترین میزبان کی طرح اتارے گا اور جہاں اتارے گا اس سرزمین کو تمھارے لیے مبارک بنائے گا، تم پھولو پھلوگے اور انہی چند افراد اور تھوڑے سے وسائل معاش سے یہ دنیا پھر آباد و معمور ہوگی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ (۳۰)

سرگزشت کے اصل مدعا کی طرف اشارہ

یہ اس اصل مدعا کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سرگزشت کے اندر غور کرنے والوں کے لیے بہت سے حقائق ہیں۔ سب سے واضح حقیقت تو اس سے یہ سامنے آتی ہے کہ خدا اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اس نے خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ رسول کی مخالفت اور اس کی تکذیب کے درپے ہوتے ہیں ایک حدِ خاص تک اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا ہے لیکن بالآخر خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر کوئی ان کو چھڑا نہیں سکتا۔ تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں فوز و فلاح رسول اور اس کے ساتھیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ البتہ اس فوز و فلاح سے پہلے انھیں آزمائش کے ایک دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ 'وَاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ' سے اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چوتھی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس طرح رسولوں کی دعوت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اسی طرح ان کے مخالفین کی مخالفت کا انداز بھی ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اس وجہ سے ہر رسول کی زندگی دوسرے رسولوں کے لیے اور ہر امت کی سرگزشت دوسری امت کے لیے ایک مستقل درس ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ (۳۱)

عاد اور ثمود کی طرف اشارہ

'قرون' جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، مصدری کے مفہوم میں بھی آتا ہے اور اس سے ایک دور کے لوگ اور قوم و امت بھی مراد ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قومِ نوحؑ کو تباہ کر دینے کے بعد نوحؑ اور ان کی کشتی کے ساتھیوں کی نسل سے ہم نے دوسری قومیں اٹھائیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود کی طرف ہے۔ سورۂ اعراف میں قومِ نوحؑ کے جانشین کی حیثیت سے قومِ عاد کا اور عاد کے خلفاء کی حیثیت سے ثمود کا ذکر ہوا ہے۔

فَاَرْسَلْنَا فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۳۲)

حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی طرف اشارہ

یہ ان رسولوں کی طرف اشارہ ہے جو عاد و ثمود کی طرف بھیجے گئے۔ یعنی حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کی طرف جن کی سرگزشتیں سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں گزر چکی ہیں۔ 'اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ' میں 'اَنْ' سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یعنی اس پیغام کے ساتھ ان کو بھیجا کہ لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ یہ دعوت بعینہٖ وہی دعوت ہے جو حضرت نوحؑ نے دی اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

'رَسُوْلًا مِّنْهُمْ' یعنی یہ رسول بھی انہی قوموں کے اندر کے فرد تھے۔ کوئی فرشتے یا جن نہیں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا

بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ہر قوم کی طرف رسول انہی میں سے بھیجا۔ اس احسان کے مختلف پہلوؤں کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ (۳۳)

متکبرین کے استکبار کی علت

'ملأ' کی وضاحت، آیت ۲۴ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں ان متکبرین کی بعض ایسی صفات بیان ہوئی ہیں جن سے ان کے طغیان اور رعونت کے اصل سبب پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت اور آخرت میں خدا کے آگے پیشی کے منکر و مکذب تھے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان کو دنیا میں جو رفاہیت و خوش حالی حاصل ہوئی ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ انھوں نے سمجھا کہ ان کی یہ دنیاوی کامیابیاں ان کے عمل اور عقیدہ کی صحت کی دلیل ہیں، آخرت اول تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو جو کچھ ان کو یہاں حاصل ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ آخرت میں اس سے محروم ہو جائیں۔ اس دولت و رفاہیت کے سبب سے وہ اپنے اوپر کسی کی برتری تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، اور وہ بھی ایک ایسے شخص کی برتری جس کو ان کی طرح مال و جاہ حاصل نہیں تھا! اپنے اس غرور پر انھوں نے یوں پردہ ڈالنے کی کوشش کی کہ اگر خدا کسی کو ہماری رہنمائی کے لیے بھیجنے والا ہی ہوتا تو کسی مافوق بشر ہستی کو بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بنانے کے کیا معنی!

وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ (۳۴)

عوام کو بھڑکانے کے لیے جذباتی حربہ

یہ اپنے عوام کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے انھوں نے ایک جذباتی حربہ استعمال کیا کہ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کو، خدا کا رسول مان کر، اس کا قلادۂ اطاعت اپنی گردن میں ڈال لیا تو دین اور دنیا دونوں اعتبار سے اپنی لٹیا ڈبو دو گے۔ معلوم نہیں یہ شخص تمھیں کس کھڈ میں گرائے اور کہاں لے جا کے مارے کہ وہاں تم پانی بھی نہ پاؤ! مطلب یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی مہلک قدم اٹھانے سے پہلے خوب سوچ لو۔ ہم تمھیں نیک و بد اچھی طرح سمجھائے دیتے ہیں!

أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ مُخْرَجُونَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ (۳۵-۳۶)

'ھیھات' کا موقع استعمال اور مفہوم

'وعد یعد' یہاں ڈرانے کے معنی میں ہے جس طرح اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ میں ہے یعنی شیطان تمھیں غریبی سے ڈراتا ہے۔ 'ھیھات' اسم فعل ہے۔ یہ عربی میں مختلف شکلوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس موقع پر بولا جاتا ہے جب کسی چیز کو نہایت مستبعد اور بعید از امکان ظاہر کرنا ہو۔ تکرار کی صورت میں اس کے اندر تاکید اور شدت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ استفہام یہاں انکار کے مفہوم میں ہے۔

یعنی وہ بہت تعجب اور حیرت سے کہتے ہیں کہ کیا یہ شخص تمھیں اس بات سے ڈراتا ہے کہ جب تم مر کر اور سڑ گل کر مٹی اور ہڈی بن جاؤ گے تو از سر نو زندہ کر کے قبروں سے نکالے جاؤ گے! یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے یہ نہایت ہی مستبعد اور نہایت ہی بعید از امکان ہے! مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی اس طرح کی خیالی باتوں سے

مرعوب ہوکر کہیں اس کے جال میں نہ پھنس جانا۔

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ (۳۷)

منکرین قیامت کی خردباختگی

یعنی زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم مرتے ہیں اور یہیں جیتے ہیں۔ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ پرانے مکذبین قیامت ہوں یا نئے دونوں ہی نے قیامت کا انکار کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں بلکہ مجرد اس کے استبعاد کی بنا پر کیا ہے۔ دراں حالیکہ اس سے ہزاروں لاکھوں درجہ مستبعد چیزیں ہر وقت اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ان کو مانتے ہیں۔ قرآن نے لوگوں کی اسی خردباختگی پر جگہ جگہ اظہار تعجب کیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ (۳۸)

اوپر کی باتیں تو ان دانشوروں نے اپنے عوام کو برگشتہ و مشتعل کرنے کے لیے کہیں اور پھر اپنی دانش و بینش کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ اگر کوئی اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس شخص کو رسول باور کرتا ہے تو کرے ہمارے نزدیک تو اس نے خدا پر یہ جھوٹ گھڑا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس وجہ سے ہم تو اس کے اس دعوے کو ہرگز باور کرنے والے نہیں ہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ (۳۹)

یہ آیت اوپر گزر چکی ہے اور وہاں اس کی پوری تشریح ہو چکی ہے۔

قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ (۴۰)

پیغمبر کی مذکورہ دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا کہ اب وعدۂ الٰہی کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے اپنی اس رعونت پر یہ لوگ بہت جلد پچھتائیں گے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (۴۱)

'صَیْحَۃ' کا مفہوم

'صَیْحَۃ' کے معنی ڈانٹ کے ہیں اور قرآن میں یہ عذاب الٰہی کی تعبیر کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے، خواہ وہ عذاب کسی شکل میں ظاہر ہوا ہو۔ اس کو سخت آواز کے عذاب کے ساتھ مخصوص کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

'حق' کا مفہوم

'حق' سے مراد یہاں وہ وعدۂ حق ہے جو تکذیب کی صورت میں بشکل عذاب لازماً ظاہر ہونے والا تھا اور جس کی پیغمبر نے ان کو خبر دے دی تھی۔

'غثا' کا مفہوم

لفظ 'غثاء' قرآن مجید اور کلام عرب دونوں میں دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ اعلیٰ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل بحث کریں گے۔ یہاں یہ پامال شدہ خس و خاشاک کے مفہوم میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی اس دعا کے بعد ان پر خدا کا عذاب اس امر واقعی کے ساتھ آ دھمکا جس کو لوگ محض خالی خولی دھمکی سمجھ رہے تھے اور ہم نے ان کو بالکل خس و خاشاک بنا کر رکھ دیا۔

'فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ'۔ لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے۔ یعنی ایسے ناہنجاروں پر خدا کی پھٹکار ہو یا یہ اس

عذاب کی معنوی تعبیر ہے۔ عذابِ الٰہی درحقیقت خدا کی لعنت ہوتا ہے۔

ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ (۴۲)

بعد کے انبیاء کی طرف اشارہ

اوپر والی آیت ۳۱ میں لفظ 'قرن' آیا ہے، اور یہاں 'قرون' جمع ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے بعد بالتدریج حضرت نوحؑ کی نسل سے متعدد قومیں اٹھیں اور ان میں سے ہر ایک کی ہدایت و اصلاح کے لیے خدا نے اپنے رسول بھیجے۔ اگرچہ ان تمام رسولوں کے نام نہ تورات میں مذکور ہیں، نہ قرآن میں لیکن قرآن اور تورات دونوں میں یہ اشارہ موجود ہے کہ خدا نے تمام قوموں میں اپنے رسول بھیجے۔ قرآن میں تو یہ بات نہایت واضح الفاظ میں فرمائی گئی ہے لیکن یہود چونکہ اپنے مخصوص خاندان کے انبیاء کے سوا دوسرے انبیاء کی تاریخ گم کرنے کے درپے ہمیشہ رہے ہیں اس وجہ سے تورات میں اس بات کا ذکر واضح الفاظ میں نہیں ہے۔ تاہم اشارات اس میں بھی موجود ہیں۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (۴۳)

قوموں کی اجل معین کا اندازہ اور قریش کو تنبیہ

میرے نزدیک یہاں، عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ اور اوپر کی آیت اور اس آیت کے درمیان، وضاحتِ قرینہ کی بنا پر، خلا بھی ہے۔ اگر محذوف کو کھول دیجیے اور خلا کو بھر دیجیے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ان قوموں کی طرف ہم نے اپنے رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کی جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ ہر قوم اپنی مہلت پوری کر چکنے کے بعد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچی۔ نہ کسی قوم پر اس کی اجل معین پوری ہونے سے پہلے عذاب آیا اور نہ کسی قوم کو، اجل معین پوری ہو جانے کے بعد ایک منٹ کی مہلت ملی۔ قوموں کی ہلاکت کی 'اجل' سے متعلق ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اجل قوموں کے اخلاقی زوال کے پیمانہ سے ناپ کر مقرر کی ہے اور یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کب کوئی قوم اپنے اخلاقی زوال کی اس حد کو پہنچی کہ اب اس کے وجود سے خدا کی زمین کو پاک ہو جانا چاہیے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اپنے رسول سے عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ جب تمھارا پیمانہ بھر جائے گا تو تم بھی فنا کر دیے جاؤ گے۔ نہ تمھارے جلدی مچانے سے خدا وقت سے پہلے تم پر عذاب بھیجے گا اور نہ وقت پورا ہو جانے کے بعد ایک سیکنڈ کی مہلت دے گا۔ قوموں کے باب میں سنت الٰہی یہی رہی ہے، اسی سنت کے مطابق تمھارے ساتھ بھی معاملہ ہوگا۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۖ كُلَّ مَا جَاءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ ۚ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُم بَعْضًا وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ (۴۴)

'تترٰی' کا مفہوم

'تترٰی' کی اصل 'وترٰی' ہے۔ عربی کے معروف قاعدے کے مطابق 'و'، 'ت' سے بدل گئی ہے۔ 'جاء القوم تترٰی' کے معنی ہوں گے لوگ تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے آئے۔

قوموں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ان کی اصلاح کے انتظام میں اضافہ

بالتدریج قوموں کی تعداد میں جتنا ہی اضافہ ہوتا گیا اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت و اصلاح کے اہتمام و انتظام میں بھی اسی رفتار سے اضافہ فرمایا۔ یہاں تک کہ ایک ہی دور میں الگ الگ قوموں میں الگ الگ رسول بھی آئے۔ اگرچہ

تاریخوں میں تفصیل نہیں ملتی لیکن حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ کا ایک زمانے میں ہونا تو قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت شعیبؑ ایک ہی دور کے رسول ہیں۔ یہ اہتمام اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ خدا اپنی خلق کی اصلاح سے کبھی بے پروا نہیں رہا ہے۔ لیکن جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا اس نے اس کی تکذیب کی جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ یکے بعد دیگرے ہر قوم کو خدا نے ہلاکت کے اسی گڑھے میں جھونک دیا جس میں اس کی پیشرو قوم کو پھینکا۔ 'وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ' یعنی پھر یہ ہوا کہ جن کو اپنے کر و فر، اپنی قوت و شوکت اور اپنے عروج و اقبال پر بڑا ناز و فخر تھا وہ ماضی کی ایک داستانِ پارینہ بن کے رہ گئے۔ 'فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ'۔ یہ جیسا کہ آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے، لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے اور اس جملہ کے موقع و محل سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ باوجودیکہ ان قوموں کی تاریخ بہت پرانی ہو چکی ہے لیکن ان کے عدم ایمان پر خدا کا جو غضب ہے وہ بدستور باقی ہے اور آج بھی ان کے ذکر کے ساتھ خدا ان پر لعنت کرتا ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۴۵)

'آیات' اور 'سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ' سے مراد

حضرت نوحؑ کے بعد کے تمام رسولوں کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد یہ ان رسولوں کا ذکر ہے جن کی مفصل سرگزشت تورات و انجیل کے صحیفوں میں موجود ہے۔ فرمایا کہ ہم نے اپنی نشانیوں اور ایک حجت قاطعہ کے ساتھ موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا۔ 'آیات' سے مراد میرے نزدیک وہ عام معجزات ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعونیوں کے انذار کے لیے ظاہر ہوئے۔ ان کی تفصیل تورات میں بھی موجود ہے اور ہم نے اپنی اس کتاب میں بھی ان کے حوالے دیے ہیں۔ 'سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ' سے میرے نزدیک عصا کا معجزہ مراد ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اس معجزے کو درحقیقت ایک برہان اور حجتِ قاطع کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے اس کو 'سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ' سے تعبیر فرمایا۔ اسی معجزے کے ذریعہ سے فرعون اور اس کے درباریوں نے اپنی قوم اور اپنے تمام ماہر جادوگروں کے سامنے نہایت رسواکن شکست کھائی۔ قرآن میں بعض جگہ اس کو 'بَيِّنَة' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی نہایت واضح حجت۔ لفظ 'سلطان' سورۂ رحمان کی آیت 'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ' میں توقیع الٰہی اور سندِ خداوندی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس اعتبار سے بھی معجزۂ عصا کے لیے یہ لفظ نہایت موزوں ہے اس لیے کہ اس کی حیثیت حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں فی الواقع ایک خدائی سند ہی کی تھی۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۚ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ (۴۶-۴۸)

فرعونیوں کے قومی مزاج کی خصوصیت

یعنی انھوں نے بھی وہی استکبار کی روش اختیار کی جو ہمیشہ سے انبیاء کے مکذبین کی رہی ہے۔ 'وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ'۔ ان کے قومی مزاج کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ استکبار ان کے کسی وقتی ہیجان و اشتعال کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ تھے ہی نہایت سرکش اور مغرور لوگ۔ فرعونیوں کے اسی مزاج کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو فرمایا کہ اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (طٰہٰ : ۲۴) (فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے) اور یہ بات بھی ہم اس کے محل میں ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰ کو عصا کا معجزہ جو عطا فرمایا تو اسی لیے عطا فرمایا کہ ان کا مقابلہ سخت سرکشوں سے تھا۔ ان سرکشوں کی سرکوبی کے لیے حضرت موسیٰ کا مسلح ہونا ضروری تھا۔ فَقَالُوٓا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ یہ ان کے استکبار کی وضاحت ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو حق سے بالاتر سمجھا اور کہا کہ ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات باور کر کے اپنے اوپر ان کی بالاتری کس طرح تسلیم کر لیں بالخصوص جب کہ ان کی قوم ہماری غلامی و تابعداری کر رہی ہے! فَكَذَّبُوهُمَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ نتیجہ یہ نکلا کہ اس غرّے میں مبتلا ہو کر انھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلا دیا اور اسی کھڈ میں جا گرے جس میں ان سے پہلے ان کے بہت سے ہم مشرب گر کے تباہ ہو چکے تھے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۴۹)

حضرت موسیٰ اور ان کی قوم پر انعام

فرعون اور فرعونیوں کی سرکوبی کے بعد یہ وہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم پر فرمایا کہ فرعون اور اس کے درباری تو اس غرّے میں مبتلا رہے کہ بھلا وہ ایک ایسے شخص کی بات کس طرح مانیں جو ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو ان کی غلامی کر رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی شخص اور اس کی قوم کو اپنی کتاب سے سرفراز فرمایا کہ وہ زندگی کے مراحل میں اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'الکتاب' سے یہاں تورات کے سوا کسی اور چیز کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور تورات کے متعلق معلوم ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کو مصر سے ہجرت کے بعد عطا ہوئی ہے۔ 'یَهْتَدُوْنَ' جمع کا صیغہ قوم کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے جس کا ذکر فرعونیوں کے قول 'وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ' میں گزر چکا ہے۔

'ذات قرار'

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَّآوَيْنٰهُمَآ إِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (۵۰)

'معین' کا مفہوم

'ربوۃ' مرتفع اور ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ 'ذات قرار' کے معنی پرسکون اور 'معین' کے معنی چشمہ کے ہیں۔

حضرت مریم اور حضرت مسیح کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ

یہ سیدنا مسیح کے وقتِ ولادت کی طرف اشارہ ہے۔ جب حضرت مریم کو ایک الگ تھلگ جگہ ایک درخت کے نیچے جا بیٹھنے کی غیبی ہدایت ہوئی۔ یہ جگہ مرتفع اور پرسکون تھی۔ یہاں کھجور کا ایک مثمر درخت بھی تھا اور اس کے نیچے ایک صاف و شفاف شیریں چشمہ بھی۔ اپنی زندگی کے اس نازک مرحلہ میں حضرت مریم ایک پرسکون گوشۂ تنہائی کی سخت محتاج تھیں تاکہ زبانِ خلق کے طعنوں اور کچوکوں سے محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل و رحمت سے ان کے لیے ایک پرامن گوشۂ راحت مہیا فرما دیا۔ یہ ساری تفصیل سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے اس 'ربوۃ' کے محل و مقام کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس واقعہ کے ایک عظیم نشانی ہونے کی بھی وضاحت کی ہے۔ چونکہ یہ تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی تھیں اس وجہ سے قرآن نے یہاں صرف اشارہ کر دیا ہے۔

تو خود حدیثِ مفصل بخواں ازیں مجمل

۷۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۵۱-۶۷

آگے یہ واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام رسولوں کو ایک ہی دین دیا لیکن ان کی امتوں نے اس دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور اب جس کے پاس جو کچھ ہے اسی میں مگن ہے، اس کے خلاف کچھ سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ان کو کچھ دن اور موقع دو۔ یہ اپنی دنیوی کامیابیوں پر خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ بڑے تیر مار رہے ہیں حالانکہ یہ صرف اپنی تباہی کے سامان کر رہے ہیں لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہے۔ اصلی فتوحات دراصل وہ لوگ حاصل کر رہے ہیں جو آج خدا سے ڈرتے اور اس کی آیات پر ایمان لا رہے ہیں۔ بے شک یہ بازی جیتنے والے لوگ ہیں۔ رہے یہ بر خود غلط لوگ تو جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے لیکن کسی طرف سے ان کی کچھ شنوائی نہ ہوگی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۶۷

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا ۖ إِنِّى بِمَا تَعْمَلُونَ
عَلِيمٌ ﴿۵۱﴾ وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ ﴿۵۲﴾
فَتَقَطَّعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿۵۳﴾
فَذَرْهُمْ فِى غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۵۴﴾ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ
مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿۵۶﴾
إِنَّ ٱلَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿۵۷﴾ وَٱلَّذِينَ هُم بِـَٔايَٰتِ
رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۸﴾ وَٱلَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴿۵۹﴾ وَٱلَّذِينَ
يُؤْتُونَ مَآ ءَاتَوا۟ وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَٰجِعُونَ ﴿۶۰﴾
أُو۟لَٰٓئِكَ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ وَهُمْ لَهَا سَٰبِقُونَ ﴿۶۱﴾ وَلَا نُكَلِّفُ
نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَلَدَيْنَا كِتَٰبٌ يَنطِقُ بِٱلْحَقِّ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۶۲﴾
بَلْ قُلُوبُهُمْ فِى غَمْرَةٍ مِّنْ هَٰذَا وَلَهُمْ أَعْمَٰلٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ
هُمْ لَهَا عَٰمِلُونَ ﴿۶۳﴾ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِم بِٱلْعَذَابِ إِذَا

هُمْ يَجْـَٔرُونَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُم مِّنَّا لَا تُنصَرُونَ ﴿٦٥﴾ قَدْ
كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ ﴿٦٦﴾
مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ ﴿٦٧﴾

ترجمہ آیات ۵۱-۶۷

اے رسولو، پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ جو کچھ تم کرو گے میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو۔ ۵۱-۵۲

پس امتوں نے اپنے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب ہر گروہ اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے تو ان کو ان کی سرمستی میں کچھ دن چھوڑ دو۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کے مال و اولاد میں اضافہ کر رہے ہیں تو ان کے لیے بھلائی میں اضافہ کر رہے ہیں؟ بلکہ ان کو اصل حقیقت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ ۵۳-۵۶

بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت ترساں ہیں۔ اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہوئے ہوتے ہیں کہ انھیں خدا کی طرف پلٹنا ہے ــــ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان کو پا کر رہیں گے ــــ اور ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور ہمارے پاس ایک رجسٹر ہے جو بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دے گا اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہو گی۔ ۵۷-۶۲

بلکہ ان لوگوں کے دل اس چیز سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کے کچھ اور مشاغل

ان کے ماسوا ہیں، یہ انہی میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کے مترفین کو عذاب میں پکڑیں گے تو وہ آہ و فریاد کریں گے۔ اب آہ و فریاد نہ کرو، اب ہماری طرف سے تمھاری کوئی مدد نہیں ہوگی! جب ہماری آیتیں تم کو سنائی جاتی تھیں تو تم پیٹھ پیچھے بھاگتے تھے، گھمنڈ کرتے ہوئے گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ رہے ہو! ۶۳-۶۷

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۵۱)

تمام رسولوں کو مشترک ہدایت

یہ اس ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو دی کہ اللہ کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو کچھ تم کرو گے میں اس سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ مطلب اس بات کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ اللہ نے تو اپنے رسولوں کو یہ ہدایت دی، اسی پر انھوں نے عمل کیا اور اسی کی اپنی اپنی امتوں کو دعوت دی لیکن ان کی امتوں نے خود اپنے جی سے، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت طیبات کو حرام اور خبائث کو حلال ٹھہرایا اور اپنے رسولوں کی بتائی ہوئی شاہراہ چھوڑ کر بدعملی اور کفر و فسق کی راہ اختیار کی۔

اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ: میں تہدید و تسلی دونوں ہے۔ یعنی اگر تم نیک عمل کرو گے تو وہ بھی میرے علم میں رہے گا اور میں اس کا پورا پورا صلہ دوں گا اور اگر برائی کا ارتکاب کرو گے تو وہ بھی میرے علم میں رہے گی اور میں اس کی سزا بھی دے کر رہوں گا۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۵۲-۵۳)

تمام انبیاء کی مشترک دعوت کے برخلاف ان کی امتوں کا رویہ

ان تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی رہی ہے اور یہ سب ایک ہی امت ہیں۔ یہ ایک ہی دین لے کے آئے اور لوگوں کو ایک ہی امت بنانے کی کوشش کی اور میں ہی سب کا رب ہوں۔ یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے لیکن امتوں نے اپنی باہمی ضد م ضدا سے اپنے واحد دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اب حال یہ ہے کہ جو کچھ جس کے پاس ہے وہ اسی میں مگن ہے بعینہٖ یہی بات تمام انبیاء کی دعوت کا حوالہ دینے کے بعد سورۂ انبیاء میں یوں فرمائی گئی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (۹۲-۹۳) (یہ سب تمھاری ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمھارا رب ہوں تو میری ہی بندگی کرو اور انھوں نے اپنے درمیان اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا)

یہی مضمون اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً قف	لوگ ایک ہی امت بنائے گئے (توان لوگوں نے اس میں اختلاف
فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ	کیا) تو اللہ نے نبیوں کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے
مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	والا بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ قولِ فیصل کے ساتھ کتاب
بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا	اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے جس
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا	میں انھوں نے اختلاف کیا اور اس میں اختلاف انہی لوگوں
الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ	نے کیا جن کو وہ چیز دی گئی تھی، کھلی ہوئی تنبیہات کے آجانے
الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (۲۱۳)	کے باوجود محض آپس کی ضدم ضدا کے باعث۔

انبیاء اور ان کی امتوں کے باب میں قرآن کا موقف

یہاں نبیوں اور امتوں کے باب میں قرآن کے موقف کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ اگرچہ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ اور سورۂ انبیاء کی تفسیر میں ہو چکی ہے لیکن اس کو اچھی طرح نہ سمجھنے کے باعث لوگ شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں اس وجہ سے ہم اصل حقیقت پھر واضح کیے دیتے ہیں۔

قرآن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا میں خدا کے جو نبی اور رسول آئے وہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور انھوں نے الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی نے ایک ہی امت ـــــ امت مسلمہ ـــــ کے قائم کرنے کی جد و جہد کی۔ جب قوموں نے اس دین میں بگاڑ پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی اور رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں نے اصل دین سے الگ کوئی چیز نہیں پیش کی بلکہ صرف اصل دین کو قائم کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا اور اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت متقتضی ہوئی تو انھوں نے اسی دین کے مزید مقتضیات نمایاں کیے۔ قرآن اسی مبارک سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اس نے اصل دین کو، جس کی دعوت آدمؑ و نوحؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ تک ہر نبی نے دی، بالکل نکھار کر، اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا ہے اور اس کے جو پہلو ابھی تشنۂ تکمیل تھے اور جن کی تکمیل کا کام، سابق انبیاء کی پیشینگوئیوں کے مطابق آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا، ان کی اس نے تکمیل کر دی۔ اپنی اس حقیقت کے اعتبار سے تمام ملتوں اور قوموں کا اصل دین یہی ہے۔ لیکن قوموں نے اپنی تنگ نظری اور تعصب کے سبب سے اس کی مخالفت کی اور اب جس کے پاس جو کچھ ہے، خواہ وہ کتنا ہی محرّف اور ناتمام ہو، وہ اسی پر اڑا ہوا اور اسی میں مگن ہے ـــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے طور پر فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ ایسے شامت زدہ ہیں کہ وہ اپنے ہی کھوئے ہوئے خزانے سے بہرہ مند نہیں ہونا چاہتے ان کا غم تم کہاں تک کھاؤ گے!

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ (۵۴)

'غَمْرَةٌ' سے مراد یہاں غفلت کی سرمستی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جب تم نے

ان کو اتنا جھنجھوڑا لیکن یہ کروٹ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اب ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ خود بہت جلد اپنی اس سرمستی کا انجام دیکھ لیں گے۔ 'حَتّٰى حِيْنٍ' سے مراد مہلت کی وہ مدت ہے جو ان کے لیے مقرر تھی اور جس کے ختم ہونے کا وقت اب قریب آ لگا تھا۔

أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ (۵۵-۵۶)

سرگشتگانِ دنیا کو تنبیہ

'مَالٍ وَّبَنِيْنَ' دنیاوی رفاہیت کی ایک جامع تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سرمستوں کی سرمستی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کو دنیا کی جو خوشحالیاں دے رکھی ہیں ان کی تھپکیاں ان کو جاگنے نہیں دے رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عیش جو ان کو حاصل ہے، ان کی زندگی کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے اور ان کامیابیوں اور فتوحات میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہے گا اس وجہ سے کسی ڈرانے والے کے ڈراووں سے ڈر کر انہیں اپنا عیش مکدر نہیں کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ اگر وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں تو بہت غلط سمجھے ہیں۔ یہ جن چیزوں کو کامیابیاں تصور کیے ہوئے ہیں یہ کامیابیاں نہیں ہیں بلکہ یہ قدرت کے استدراج کا پھندا ہے جس میں پھنس جانے کے بعد وہ کبھی اس سے چھوٹ نہیں سکیں گے لیکن وہ اپنی بلادت کے سبب سے اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ۝ (۵۷-۶۱)

بازی جیتنے والوں کی صفات

یہاں سورہ کی ابتدائی دس آیات پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں جن اہلِ ایمان کو فوز و فلاح کی بشارت دی گئی ہے۔ انہی کا ذکر ذرا مختلف الفاظ میں پھر فرمایا کہ البتہ یہ لوگ، جن کی صفات یہ یہ ہیں، حقیقی کامیابیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور بے شک یہ لوگ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ کے رہیں گے۔ ان لوگوں کی مندرجہ ذیل صفات یہاں گنائی ہیں اور یہ صفات ان مسلمانوں کی ہیں جو اس دور میں دنیا کی تمام مرغوبات سے منہ موڑ کر رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت لرزاں و ترساں ہیں۔ اس کی شہادت ان کی نمازوں سے ملتی ہے۔ چنانچہ اوپر فرمایا ہے۔ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۔

دوسری صفت یہ ہے کہ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ' یہ متکبرین کی طرح خدا کی آیات کا مذاق نہیں اڑاتے بلکہ جب اللہ کا رسول ان کو یہ آیات سناتا ہے تو وہ ان پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں۔

تیسری صفت یہ ہے کہ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ' ان کا سارا اعتماد اپنے رب پر ہے وہ کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ' وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں نمائش اور فخر کے لیے نہیں خرچ کرتے بلکہ خدا کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں

کہ ایک دن اس کو منہ دکھانا ہے۔ 'اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ' میرے نزدیک 'وَجِلَةٌ' کے وضاحت کے طور پر ہے۔ اس سے اس خوف کی وضاحت ہو گئی جو ان کے دلوں میں سمایا ہوا ہے۔

'اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ' فرمایا کہ بے شک یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں اور کامیابیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور یہ ان نیکیوں کے ثمرات پا کے رہیں گے نہ کہ وہ لوگ جو ہمارے استدراج کو اپنی فتوحات سمجھ رہے ہیں اور برابر اپنی ہلاکت کے غار کی طرف آنکھیں بند کیے ہوئے بگ ٹٹ بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ یہ آیت اوپر کی آیت ۵۶ کی مقابل آیت اور شروع کے مضمون 'قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ' الآیہ کی وضاحت مزید کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں دونوں آیتوں کے اسلوبِ بیان کے اس فرق پر بھی نگاہ رہے کہ اوپر تو فرمایا کہ 'نُسَارِعُ لَهُمْ فِى الْخَيْرٰتِ' (یہ عیشِ دنیا کے متوالے اس مغالطہ میں ہیں کہ ان کے مال و اولاد میں ہم جو اضافہ پر اضافہ کر رہے ہیں یہ ان کے لیے خیر میں اضافہ کر رہے ہیں) اور ان اہلِ ایمان کے باب میں فرمایا کہ 'اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ' بے شک یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور یہ اپنی بازی جیتیں گے۔ اسلوبِ بیان کا یہ فرق واضح کرتا ہے کہ اس دنیا میں انسان جو کچھ پاتا ہے وہ بہرحال خدا ہی کے دیے پاتا ہے اور اس کی حیثیت انعام کی نہیں بلکہ امتحان کی ہوتی ہے۔ البتہ آخرت میں انسان جو کچھ پائے گا وہ اس کی اپنی سعیِ عمل کا ثمرہ اور اس کی اپنی محنت کا اجر ہو گا تو جس کو مسابقت کرنی ہو وہ اس میدان میں کرے۔ نہ کہ اس میدان میں جس کی ہر چیز محض وقتی اور آزمائشی ہے۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۶۲)

اہلِ ایمان کو ایک بشارت

یہ بطور جملہ معترضہ اہلِ ایمان کے لیے اسی طرح کی بشارت اور تسلی ہے جس طرح کی بشارت بقرہ کی آخری آیت میں گزر چکی ہے۔ یعنی ہر چند ہے تو یہ امتحان سخت لیکن اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ ہم اپنی راہ میں مسابقت کرنے والوں کو کسی ایسے امتحان میں نہیں ڈالتے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور یہ اطمینان بھی رکھیں کہ وہ ہماری راہ میں جو مشقت بھی جھیلیں گے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، وہ ہمارے پاس ایک رجسٹر میں درج ہوتی ہے، وہ رجسٹر جزائے اعمال کے دن، ہر ایک کے تمام اعمال کا پورا پورا ریکارڈ، بالکل ٹھیک ٹھیک پیش کر دے گا۔ اور ہر شخص اس کے مطابق اپنے ہر عمل کا صلہ پائے گا، کسی کی ذرہ برابر بھی کوئی حق تلفی نہ ہو گی۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِىْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝ حَتّٰىٓ اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ (۶۳-۶۴)

مترفین اور ان کے پیرووں کا انجام

اس اضراب کا تعلق متکبرین کے اسی مغالطہ سے ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ وہ اپنی رفاہیت و خوش حالی کو اپنی نیک اعمالی و نیک مآلی کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں۔ وہاں صرف ان کے مغالطہ کی طرف اشارہ کر کے کلام اہلِ ایمان کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب پھر وہی سلسلۂ کلام عود کر آیا۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے دل، اس انذار سے جو خدا کا رسول ان کو سنا رہا ہے، غفلت کے پردوں میں ہیں اور یہ اسی طرح اپنی سرمستیوں میں کھوئے رہیں گے اہلِ ایمان

کے جو اعمال، آیات ۵۷ — ۶۰ میں مذکور ہوئے ان کے اندر ان کے لیے کوئی کشش نہیں۔ ان کی دلچسپی کے اعمال کچھ اور ہیں اور وہ انہی میں منہمک رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب خدا کا عذاب ان کو دبوچ لے گا تب وہ فریاد کریں گے لیکن اس وقت ان کا فریاد کرنا بالکل بے سود ہو گا۔

'جَأَرَ يَجْأَرُ' کے معنی تضرع و زاری کرنے کے ہیں اور 'مُتْرَفِيْن' مالداروں اور خوش حالوں کو کہتے ہیں۔ وہ عذابِ الٰہی جو رسول کے انذار کے نتیجہ میں آتا ہے وہ اصلاً مترفین ہی کے لیے آتا ہے اس لیے کہ رسول کے انذار سے اصلی کد انھیں کو ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ لیکن ضمناً اس کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو مترفین کے طبقہ سے تو نہیں ہوتے لیکن اپنی شامتِ اعمال سے آلۂ کار انھیں کے بن جاتے ہیں اس وجہ سے جس طرح گندم کے ساتھ گھن پس جاتا ہے اسی طرح اپنے سرپرستوں کے ساتھ وہ بھی پس جاتے ہیں۔

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۝ (۶۵ - ۶۶)

یعنی اس وقت ان کی فریاد کا جواب ہماری طرف سے یہ ہو گا کہ اب ہمارے آگے رونے گڑگڑانے کا وقت گزر چکا۔ اس کا موقع پہلے تھا لیکن اس وقت تو تمھاری رعونت کا حال یہ رہا کہ جب ہماری آیاتِ انذار تم کو سنائی جاتیں تو تم پیٹھ پیچھے بھاگتے اور ہمارے رسول کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تو اب اپنی ضد کا انجام بھگتو! اب ہماری طرف سے اپنے لیے کسی خیر کی امید نہ رکھو اور کوئی دوسرا بھی آج ہمارے مقابل میں تمھاری کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ فرعون کی سرگزشت میں بھی بعینہٖ یہی بات مذکور ہوئی ہے۔ وہ جب طوفان کی لپیٹ میں آگیا تو چلایا کہ میں موسیٰؑ و ہارونؑ کے رب پر ایمان لایا۔ لیکن اس کا یہ اقرارِ ایمان درخورِ اعتنا نہیں ٹھہرا۔ بلکہ اس کو جواب ملا کہ 'اب ایمان لائے! ایمان لانے کا وقت پہلے تھا، جب تم نے نافرمانی کی'۔ پیچھے ہم اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ بات قولاً بھی ہو سکتی ہے اور صورتِ حال کی تعبیر بھی۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ (۶۷)

آیت ۶۷ کی تالیف اور اس کی تاویل

اس آیت کی تالیفِ کلام اور اس کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ ان کے اقوال نقل کرنے اور ان پر تنقید کرنے میں بڑی طوالت ہو گی اس وجہ سے ہم صرف اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

'اِسْتِكْبَار' کے بعد 'ب' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ لفظ یہاں استہزاء کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'بِهٖ' کی ضمیر مجرور کا مرجع مفسرین کے ایک گروہ نے لفظ 'آیات' کو قرار دیا ہے، جو اوپر والی آیت میں مذکور ہے، اور اس کو علیٰ سبیل التاویل 'ذکر' اور 'کتاب' کے مفہوم میں لیا ہے۔ اگرچہ یہ بات عربیت کے خلاف نہیں ہے۔ 'آیت'، 'کتاب'، 'ذکر' اور 'رسول' متبادل الفاظ کی حیثیت سے قرآن میں استعمال ہوئے

ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بسا اوقات ضمیر کا مرجع یا اسم اشارہ کا مشارٌ الیہ الفاظ میں مذکور نہیں ہوتا بلکہ فحوائے کلام سے متبادر ہوتا ہے اور اس کا تعین قرینہ کرتا ہے۔ قرآن اور کلام عرب دونوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس ضمیر کا مرجع رسولؐ ہے جس کی تکذیب اور جس کے ساتھ استہزا کے عواقب اس سورہ میں زیر بحث ہیں اور جس کی تلاوت آیات قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ میں مذکور ہے۔

'سٰمِرًا' کے معنی افسانہ خواں اور قصہ گو کے ہیں۔ یہ 'تَهْجُرُوْنَ' کا مفعول بھی ہو سکتا ہے اور اگر اس کو ضمیر مجرور سے حال مانیں جب بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ مجرور سے حال پڑنے کی متعدد مثالیں اس کتاب میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

'تَهْجُرُوْنَ' اپنے بالکل معروف معنی (تم چھوڑتے تھے) میں استعمال ہوا ہے۔ اس کو اس کے معروف معنی سے ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اس تالیفِ کلام پر آپ کو اطمینان ہے تو لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ سے لے کر یہاں تک جو بات فرمائی گئی ہے وہ سادہ الفاظ میں یوں ہے کہ اب روؤ یا چلاؤ، اس سے کچھ حاصل نہیں، اب نہ ہمارے ہاں تمہاری کچھ شنوائی ہے اور نہ کوئی دوسرا ہی تم کو ہم سے چھڑا سکتا ہے۔ ہماری خوشنودی حاصل کرنے کا وقت وہ تھا جب ہمارے رسول کی زبانی تم کو ہماری آیات سنائی جا رہی تھیں لیکن اس وقت تمہاری بد دماغی کا یہ حال تھا کہ تم نہایت تکبر کے ساتھ، اس کا مذاق اڑاتے ہوئے، اس طرح اس سے کتراتے تھے گویا وہ کوئی افسانہ گو اور قصہ خواں ہے جس کی بات تمہارے نزدیک درخور اعتنا نہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے مترفین کو پچھلی قوموں کی جو سرگزشتیں سناتے ان سے وہ سبق لینے کے بجائے آپ کا مذاق اڑاتے اور اپنے عوام کو ورغلاتے کہ اس شخص کے پاس ہے کیا! پچھلی قوموں کی کچھ حکایات ہیں جن کو یہ سناتا پھر رہا ہے! اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔

۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۶۸-۹۲

آگے چند آیات میں کفار کے لاابالی پن پر زجر و توبیخ ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی ضد اور مکابرت سے مایوس نہ ہو، تم صراطِ مستقیم پر ہو اور یہ لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں، یہ اپنا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگر ہم ان لوگوں کو بطور تنبیہ کسی مصیبت میں بھی مبتلا کریں جب بھی یہ سنبھلنے والے نہیں ہیں بلکہ ان سے چھوٹتے ہی پھر اپنی سرمستیوں میں کھو جائیں گے جن میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آفاق و انفس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ لوگ لاابالی پن چھوڑ کر کچھ سوچنے

سمجھنے کی طرف مائل ہوں لیکن اس کے جواب میں بھی انھوں نے یہی کہا کہ وہ سب پچھلوں کے فسانے ہیں۔ اس کے بعد چند آیات میں لوگوں کے تضادِ فکر کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے سوال کیا ہے کہ ایک طرف تو تم صحیح باتوں کا اقرار و اعلان کرتے ہو لیکن پھر تمھاری عقل کہاں گم ہو جاتی ہے کہ ان کے بالکل برعکس باتیں مان کر ضلالت کی وادی میں بھٹک جاتے ہو! ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿۶۸﴾ آیات
أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴿۶۹﴾ أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ ۶۸-۹۲
بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ
أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ
بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ ﴿۷۱﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا
فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۷۲﴾ وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۷۳﴾ وَإِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ عَنِ الربع
الصِّرَاطِ لَنَاكِبُونَ ﴿۷۴﴾ وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ
لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۵﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ
فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿۷۶﴾ حَتَّىٰ إِذَا فَتَحْنَا
عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿۷۷﴾ وَهُوَ ع ۴ ۴۷ ۴
الَّذِي أَنْشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ﴿۷۸﴾
وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۷۹﴾ وَهُوَ الَّذِي
يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۸۰﴾
بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ﴿۸۱﴾ قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا
تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا

هٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٨٣﴾ قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ
وَمَنْ فِيهَآ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨٤﴾ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا
تَذَكَّرُونَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿٨٦﴾
سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨٨﴾
سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ ﴿٨٩﴾ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ
إِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿٩٠﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ
إِلٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٩١﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى
عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٩٢﴾ ع ٥

ترجمۂ آیات ۶۸-۹۲

کیا ان لوگوں نے کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ چیز آئی جو ان کے اگلے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آئی! یا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اس کے منکر بنے ہوئے ہیں! یا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر کچھ جنون کا اثر ہے! یہ جنون نہیں ہے بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے لیکن ان میں سے اکثر حق سے بیزار ہیں اور اگر حق ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا تو آسمان و زمین اور جو ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے۔ بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کے حصہ کی یاد دہانی لائے ہیں تو وہ اپنی یاد دہانی سے اعراض کر رہے ہیں۔ ۶۸-۷۱

کیا تم ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہو! تمھارے رب کا صلہ تمھارے لیے بہتر ہے اور وہ بہترین روزی بخشنے والا ہے! اور بے شک تم ان کو ایک سیدھی راہ کی دعوت دے

رہے ہو اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں وہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں (اور اگر ہم ان کو کبھی آزمائش میں ڈالنے کے بعد) پھر ان پر رحم کرتے اور ان کی تکلیف دور کر دیتے تو وہ بدستور اپنی سرکشی ہی پر اڑے اسی طرح بھٹکتے رہتے۔ اور ہم نے ان جیسوں کو عذاب میں پکڑا لیکن نہ وہ اپنے رب کے آگے جھکے اور نہ وہ تضرع ہی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہم ان پر ایک سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو وہ اس میں بالکل مایوس ہو کے رہ جائیں گے۔ ۷۷،۷۴

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے، پر تم بہت کم شکر گزار ہوتے ہو! اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا ہے پھر تم اسی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔ اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کی آمد و شد تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۷۸-۸۰

بلکہ انھوں نے بھی وہی بات کہی جو اگلوں نے کہی۔ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے تو از سرنو اٹھائے جائیں گے! اس کی دھمکی تو ہم کو اور اس سے پہلے ہمارے آباء و اجداد کو بھی سنائی گئی۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں! ۸۱-۸۳

ان سے پوچھو، یہ زمین اور جو اس میں ہیں کس کے ہیں، اگر تم جانتے ہو! کہیں گے اللہ کے۔ کہو تو کیا تم اس سے یاد دہانی نہیں حاصل کرتے! پوچھو، ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا خداوند کون ہے؟ کہیں گے یہ سب اللہ کے ہیں۔ کہو تو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں! پوچھو، وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے، لیکن اس کے مقابل میں پناہ نہیں دی جا سکتی، اگر تم جانتے ہو! وہ کہیں گے یہ باتیں اللہ ہی کے اختیار کی ہیں، کہو پھر تمھاری مت کہاں ماری جاتی ہے۔ ۸۴-۸۹

بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ خدا نے کسی کو اپنی اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا، خدا ایسی باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں! ۹۰-۹۲

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ (۶۸)

استفہامیہ اسلوب بقصد زجر و ملامت

یہ اور آگے جو باتیں استفہامیہ اسلوب میں آئی ہیں سب بطور اظہارِ حسرت اور بقصد زجر و ملامت ہیں۔ 'قول' سے مراد یہاں قرآن ہے جس سے اعراض کا ذکر اوپر والی آیت میں ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ آخر یہ لوگ اس قرآن سے اس درجہ کیوں بدک رہے ہیں! کیا انھوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان کا گمان یہ ہے کہ یہ ان کے باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے۔ چونکہ یہاں کلام زجر اور حسرت کے انداز میں ہے۔ اس وجہ سے بات مجمل چھوڑ دی گئی ہے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں اس وجہ سے قرآن کی باتیں ان کے دلوں میں نہیں اترتیں۔ قرآن کو باپ دادا کی روایات کے خلاف سمجھ کر اس سے بدکنا بھی نری جہالت ہے۔ نہ باپ دادا کا طریقہ بجائے خود اپنی صحت و صداقت کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کا عقل و فطرت کی کسوٹی پر پورا اترنا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں آخر یہ لوگ اپنی ناک سے آگے کیوں نہیں دیکھتے! ان کے اصل جدِا علیٰ تو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ ہیں وہ تو اسی دین کے حامل اور داعی تھے۔ یہ لوگ اپنے ان اجدادِ کرام کی پیروی کیوں نہیں کرتے، اپنے انہی آباء کی لکیر کیوں پیٹے جا رہے ہیں جو دین سے بالکل بے خبر تھے!

أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ (۶۹)

قریش کو ایک سخت خطرے سے آگاہی

یہ اس سنتِ الٰہی کی روشنی میں، جو قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، قریش کو ایک سخت خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم پر اتمامِ حجت کے لیے ایک رسول بھیجتا ہے جو اسی قوم کے اندر سے ہوتا ہے۔ اگر قوم اس پر ایمان لاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو برومند کرتا اور زمین میں اس کو اقتدار بخشتا ہے اور اگر وہ رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اتمامِ حجت کے بعد وہ لازماً فنا کر دی جاتی

ہے۔ اس وجہ سے کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت کا مرحلہ ایک بڑا ہی نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ اسی مرحلہ میں اس کی زندگی یا موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بدقسمت ہے وہ قوم جو اس مرحلہ کی نزاکت کو نہ سمجھے اور اپنے رسول کے معاملہ میں لاابالی پن کا مظاہرہ کرے۔ قریش کی اسی ناعاقبت اندیشی پر یہاں تنبیہ ہے کہ کیا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اس کا انکار کیے جا رہے ہیں یا یہ سب کچھ جان بوجھ کر ہو رہا ہے۔ دیدہ دانستہ ہو رہا ہے تو اس کھیل کا انجام معلوم ہے!

أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ ۚ بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ (۷۰)

رسول کو خبطی قرار دینے کی وجہ دراصل حق بیزاری ہے

یعنی اگر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ رسول کو خبط اور سودا لاحق ہے تو یہ خود ان کے اپنے پاگل ہونے کی دلیل ہے۔ رسول کو کوئی خبط و سودا نہیں ہے۔ وہ تو جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل حق ہے اور اس کی ایک ایک بات پوری ہو کے رہے گی۔ البتہ یہ لوگ خود حق سے بیزار ہیں۔ اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دے رہے ہیں۔ مریض کو جب طبیب کی تشخیص کردہ دوائیں کڑوی معلوم ہوتی ہیں اور وہ ان کو حلق سے اتارنے پر تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے کو مریض تسلیم کرنے کے بجائے الٹے طبیب ہی کے مشورے کو ہذیان قرار دیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا۔ یہ اپنے باطل کو چھوڑ کر حق کے کڑوے کسیلے گھونٹ حلق سے اتارنے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے رسول کو دیوانہ قرار دیتے تھے کہ اس طرح اپنی خرد باختگی پر کچھ پردہ ڈال سکیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ (۷۱)

خواہشاتِ نفس اور حق کے درمیان بعد المشرقین ہے

اب یہ خواہشاتِ نفس اور حق دونوں کے اختلافِ مزاج کو واضح فرمایا ہے کہ ان دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ خواہشاتِ نفس کے مطالبے کچھ اور ہیں، حق کے تقاضے، ان سے بالکل الگ کچھ اور ہیں۔ اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، جیسا کہ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن اور پیغمبر کی باتیں ان کی خواہشوں کے مطابق ہوں تب یہ ان کو مانیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ اس پوری کائنات کی تباہی ہے۔ اس لیے کہ یہ خیر کی جگہ شر، عدل کی جگہ ظلم، نیکی کی جگہ بدی، امانت کی جگہ خیانت اور اس سے بڑھ کر یہ کہ توحید کی جگہ شرک اور قیامت کے بجائے انکارِ قیامت کے علم بردار ہیں۔ اگر یہ تمام اقدار ان کی خواہشوں کے مطابق تلپٹ ہو جائیں تو اس دنیا کا سارا اخلاقی نظام درہم برہم ہو جائے اور اگر اس کے اندر شرک کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو شرک کے ساتھ تو اس کائنات کا نظام ایک دن بھی باقی نہ رہ سکتا۔ اس حقیقت کو آگے اسی سورہ میں یوں واضح فرمایا ہے۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۹۱) (اللہ نے نہ تو اپنے لیے کوئی اولاد بنائی اور نہ کوئی معبود اس کے ساتھ شریک ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود، جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اس کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا)

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو حق کو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلانا چاہتے ہیں اور اس دنیا کی نجات و فلاح حق کے پیچھے چلنے میں ہے۔ خالقِ کائنات اپنی دنیا کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اب یہ لوگ خود فیصلہ کریں کہ حق کے پیچھے چل کر زندگی چاہتے ہیں یا باطل کے ساتھ چمٹے رہ کر موت اور ہلاکت! اگر زندگی مطلوب ہے تو یہ گھونٹ حلق سے اتارنے پڑیں گے، خواہ کڑوے لگیں یا میٹھے۔ اس سے الگ زندگی کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔

یاددہانی سے اعراض کرنے والوں کا انجام بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یہ دوسرے الفاظ میں وہی تنبیہ ہے جو اوپر 'اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ' کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اس قرآن کو کسی افسانہ گو کی افسانہ گوئی سمجھے ہیں تو بہت غلط سمجھے ہیں۔ یہ ان کے حصہ کی وہ یاددہانی ہے جو اتمامِ حجت کے لیے ہم نے ان کی طرف بھیجی ہے۔ اگر اس یاددہانی سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو یاد رکھیں کہ ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو ان سے پہلے خدا کی یاددہانی کی ناقدری کرنے والی قوموں کا ہو چکا ہے۔ اوپر ہم اس سنتِ الٰہی کا حوالہ دے چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے اور ان رسولوں کے ذریعہ سے ان قوموں کو یاددہانی کی۔ جس قوم نے اس یاددہانی کی قدر کی اس نے فلاح پائی، جس نے اس کی قدر نہ کی وہ فنا کر دی گئی۔ یہاں اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ کر کے آگاہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ اس یاددہانی سے اعراض کیے جا رہے ہیں اور اس کے عواقب سے بے خبر ہیں!

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (٧٢)

نبی کا زاد و راحلہ اس کے ساتھ ہوتا ہے اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخالفین کے لیے ملامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان کے آگے جو کچھ پیش کر رہے ہو اس کا کوئی معاوضہ تو طلب کر نہیں رہے ہو کہ یہ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں۔ تم نے تو مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہے ہو۔ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اس میں ان کی اپنی ہی محرومی ہے۔ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تمھاری دعوت قبول نہ کی تو اس سے تمھیں کوئی نقصان پہنچا دیں گے تو بالکل غلط سمجھتے ہیں۔ تمھارے لیے تمھارے رب کا بخشا ہوا اجر ہی بہتر ہے اور وہ بہترین فضل فرمانے والا ہے۔ خدا کا رسول کوئی تاجر یا دکاندار نہیں ہوتا بلکہ ایک داعیِ حق ہوتا ہے۔ اس کی دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور یہی شان ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو نبیوں کے طریقے پر کام کرتے ہیں۔

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (٧٣-٧٤)

صراطِ مستقیم سے انحراف کی اصل علت یعنی جہاں تک تمھاری دعوت کا تعلق ہے وہ تو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چلنے کی دعوت ہے۔ اسی شاہراہ پر چل کر انسان منزلِ مقصود کو پہنچ سکتا ہے لیکن اس کو اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اگر آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو تو آخر اس کو کیا پڑی ہوئی ہے کہ وہ اپنے نفس کی آزادیوں اور بے قیدگیوں پر پہرہ بٹھائے۔ اپنی نقد لذتوں کی قربانی تو وہی دے سکے گا جس کو ایک روزِ جزا کا انتظار ہو۔ جس کو اس قسم

کے کسی دن کا انتظار نہیں ہے وہ اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے چلے گا خواہ ان کی پیروی میں وہ صراطِ مستقیم سے کتنا ہی دور نکل جائے۔ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ آپ کی بتائی ہوئی راہ سے جو لوگ انحراف اختیار کیے ہوئے ہیں اس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی پیچ و خم ہے، یہ تو بالکل سیدھی راہ ہے، خرابی جو کچھ ہے ان کے دلوں میں ہے۔ ان لوگوں کے دلوں میں آخرت پر ایمان نہیں ہے اور جن کے اندر آخرت پر ایمان نہ ہو وہ اس سیدھی راہ سے کج ہو کر ہی چلیں گے۔ حکمتِ دین کی اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے کہ جب تک اس دنیا کے ساتھ آخرت کو نہ مانیے نہ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نظر آئے گی اور نہ زندگی کی صحیح شاہراہ معین ہو سکے گی۔ اس حقیقت کو ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (۷۵)

آنحضرتؐ کو تسلی تاریخ کی روشنی میں

اس آیت میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، شرط میں سے کچھ حصہ، بربنائے وضاحت قرینہ حذف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی کہ اگر ہم ان کو بطور تنبیہ کسی مصیبت میں مبتلا کرتے کہ ان کے اندر کچھ خوفِ خدا اور تضرع پیدا ہو، پھر ان پر رحم کرتے اور ان کی مصیبت دور کر دیتے تو یہ پھر اپنی اسی سرکشی میں پڑے ہوئے اسی طرح بھٹکتے رہتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ذہنیت کے لوگوں کو عذاب کی نشانیاں بھی، جن کا یہ مطالبہ کرتے ہیں، کوئی نفع نہیں پہنچاتیں۔ اگر ان سے ان کی گردنوں میں ذرا خم پیدا ہوتا بھی ہے تو محض وقتی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ مصیبت کے دن گزرتے ہی ان کے لیڈر یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتے ہیں کہ اس طرح کے نرم و گرم حالات تو قوموں کو پیش آیا ہی کرتے ہیں، اس کو ہمارے ایمان و اخلاق سے کیا تعلق! ـــــ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ عذاب کی کوئی نشانی مانگتے ہیں تو اس کو کوئی اہمیت نہ دو۔ اس قماش کے لوگوں کو کوئی نشانی نفع نہیں پہنچاتی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ (۷۶)

تنبیہی عذاب

'وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ' یعنی 'وَلَقَدْ اَخَذْنَا اَشْیَاعَهُمْ' ہم نے ان کے ہم مشربوں کو اس سے پہلے اپنے تنبیہی عذابوں میں پکڑا لیکن نہ تو ان کے دلوں میں خستگی اور فروتنی پیدا ہوئی اور نہ وہ اپنے رب کے آگے گریہ زاری کرتے تھے۔ یہ پچھلی تاریخ کی روشنی میں اسی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ اس قماش کے لوگ تنبیہات سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو بھی کوئی تنبیہ کی گئی تو پیغمبر کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ اس سے کوئی سبق لیں گے۔ 'ھُمْ' سے مراد یہاں قریش نہیں بلکہ ان کے وہ ہم مشرب ہیں جو پچھلی امتوں میں گزر چکے تھے۔ عربی میں غایت مجانست و مشابہت کے اظہار کے مواقع میں اس طرح ضمیریں آتی ہیں۔ اس کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں موجود ہیں۔ اس میں یہ بلاغت ہے کہ اُن کو پکڑا تو گویا انہی کو پکڑا اس لیے کہ مرتکب دونوں ایک ہی جرم کے ہیں۔

'استکانۃ' اور 'تضرع' میں ظاہر و باطن کا فرق ہے۔ 'استکانۃ' دل کی شکستگی و خستگی کی تعبیر

ہے اور 'تضرّع' سے مراد وہ گریہ وزاری اور دعا و فریاد ہے جو 'استکانۃ' کے نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔
میرے نزدیک یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِیْدٍ اِذَا هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ (۷۷)

'عذابِ شدید' سے مراد — یعنی تنبیہی جھڑکیوں سے تو ان مغروروں کا دماغ درست ہونے والا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا جب ان کی اس تکذیب کے نتیجہ میں ہم ان پر اپنے عذاب شدید کے دروازے کھول دیں گے۔ 'عذابِ شدید' سے مراد یہاں وہ فیصلہ کن عذاب ہے جو سنتِ الٰہی کے تحت ہر اس قوم پر آیا جس نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی اور اپنی ضد پر اڑی رہ گئی۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں۔ اس عذاب کے ظہور کے بعد پھر قوم کو مہلت نہیں ملتی۔ اس کے تمام سہارے اور تمام امیدیں یک قلم ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف آیت کے آخری الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷۸)

کان، آنکھ اور دل کا اصلی مصرف — اوپر کے کلام میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور اس میں قریش کو جو تہدید و وعید ہے وہ غائب کے صیغہ سے ہے۔ اب یہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ خدا نے جو تم کو کان، آنکھ اور دل عطا فرمائے ہیں تو کاہے کے لیے عطا فرمائے ہیں! اسی لیے تو کہ ان سے نصیحت و حکمت کی وہ باتیں، جو تمہیں سنائی جا رہی ہیں سنو، اللہ کی وہ نشانیاں جو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی طرف تمہیں توجہ دلائی جا رہی ہے، ان کو دیکھو، اور ان سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اور جو تمہارے سامنے نہایت واضح طور پر پیش کیے جا رہے ہیں ان پر غور کرو۔ کان، آنکھ اور دل دماغ کا اصلی مصرف یہی ہے لیکن تم عجیب شامت زدہ لوگ ہو کہ حق کو ماننے کے لیے دلیل کے بجائے تنبیہ کے ڈنڈے کا مطالبہ کر رہے ہو! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل اور استدلال سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے آدمی صرف ڈنڈے ہی کی منطق سے قائل ہو تو اس میں اور گدھے میں کیا فرق رہا!

'قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ' اظہارِ حسرت و افسوس کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی بخشی ہوئی اتنی اعلیٰ نعمتیں پا کر ان کی بہت کم قدر کرتے ہو! شکر کی اصل حقیقت، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں نعمت کی قدر دانی ہے اور نعمت کی قدر دانی یہ ہے کہ آدمی اس سے صحیح فائدہ اٹھائے اور اپنے منعم کا شکر گزار ہو۔

وَهُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ (۷۹)

توحید اور قیامت کی ایک جامع دلیل — یہ قیامت اور حشر کی طرف توجہ دلا دی کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ بس یہیں پیدا ہوئے یہیں مر کھپ جاؤ گے۔ جب ایک کسان اپنے کھیت میں بوتا ہے تو محض بونے کی خاطر نہیں بوتا بلکہ ایک دن وہ اس کو اکٹھا بھی کرتا ہے۔ اسی طرح جس نے تمہیں اس زمین میں پھیلایا ہے وہ ایک دن تمہیں جمع بھی کرے گا تو

یہ یاد رکھو کہ تم صرف اسی کے کھتے میں جمع کیے جاؤ گے۔ آخر اس کی بوئی ہوئی فصل میں کوئی دوسرا کس طرح شریک بن جائے گا! غور کیجیے ان چند لفظوں کے اندر کس خوبی سے امکانِ قیامت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے، معاد کی ضرورت بھی بیان ہو گئی ہے اور توحید کی دلیل بھی واضح ہو گئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۸۰)

اختلافِ لیل و نہار کے بعض اشارات

وَاخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ سے مراد دن اور رات کی ایک دوسرے کے بعد، پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ، آمد و شد ہے۔ اس نشانی کی طرف قرآن نے جگہ جگہ توجہ دلائی ہے۔

دن اور رات کا پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ آنا اور جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس کائنات کے خالق کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ یہ بجائے خود نہ آنے کے مجاز ہیں نہ جانے کے۔

ان کے نظام میں کسی کا دخل انداز نہ ہو سکنا اس بات کی شہادت ہے کہ متصرفِ حقیقی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

اختلافِ مزاج و صورت کے باوجود ان دونوں میں اس کائنات کی پرورش کے لیے جو سازگاری ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ کارفرما ہے جو اس کے تمام اضداد میں ربط پیدا کرتا ہے اور ان کو کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

شب میں آرام کی نیند کے بعد صبح کو اٹھ کھڑے ہونا ہر انسان کے لیے قیامت کی یاددہانی ہے کہ اسی طرح برزخ کی نیند کے بعد جب اللہ تعالیٰ چاہے گا ہر شخص اٹھ کھڑا ہو گا۔

ان کے علاوہ بعض مزید اشارات بھی قرآن نے اختلافِ لیل و نہار سے نکالے ہیں اور ہم نے اس کتاب میں ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ وہی جو زندگی اور موت دیتا ہے اور جس کے دستِ تصرف میں رات اور دن کی آمد و شد ہے، وہی تمہارا حقیقی معبود ہے، اسی سے سابقہ پڑنا ہے اور اسی کی طرف تمہیں یہ بلایا جا رہا ہے تو تم کہاں بھٹکے ہوئے جا رہے ہو! کیا اتنی واضح حقیقت تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۸۱-۸۳)

وہی پرانا جواب

یعنی یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر واضح اور ثابت ہیں لیکن یہ ان کے دلوں میں کسی طرح نہیں اتر رہی ہیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ سن کے وہی بات کہی جو ان کے اگلے ہم مشربوں نے کہی۔ انھوں نے کہا بھلا جب ہم مر کے مٹی اور ہڈی بن جائیں گے تو کیا دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! یہ انہونی بات ہے! یہی ڈراوا ہمیں سنایا جا رہا ہے اور اس سے پہلے یہی ڈراوا ہمارے اگلوں کو بھی سنایا گیا لیکن قیامت کو نہ آنا تھا نہ آئی، نہ آئے گی۔ یہ سب پرانے فسانے ہیں جو بار بار دہرائے جا رہے ہیں۔ ہم ان دھمکیوں میں آنے والے نہیں ہیں!

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۸۴-۸۵)

منکرین کا تضادِ فکر

اب یہ ان منکرین کے تضادِ فکر کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ ایک طرف تو یہ آسمان و زمین کا خالق و مالک اور مختارِ کل خدا ہی کو مانتے ہیں دوسری طرف یہ ایسی باتیں بھی مانتے ہیں جو اس کے بالکل ضد ہیں یا ان باتوں کا انکار کرتے ہیں جو ان کے اس مسلمہ کے لازمی نتیجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مشرکینِ عرب کے متعلق ہم یہ بات اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کا خالق و مالک اور متصرّفِ حقیقی تو صرف خدا ہی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ شرک کی ان اقسام میں بھی مبتلا تھے جن کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ رہی قیامت تو اس کو اول تو وہ ایک نہایت مستبعد چیز سمجھتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں مانتے تھے تو ان کا خیال تھا کہ ان کے سفارشی خدا کی گرفت سے ان کو بچا لیں گے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسی قسم کا تضادِ فکر ہے جس میں بالعموم آج کل کے مسلمان مبتلا ہیں۔ یہ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس اقرار کے جو لازمی نتائج ہیں ان کا انکار بھی کرتے ہیں۔ ایمان کے مدعی بھی ہیں اور ساتھ ہی نہایت دھڑلے سے وہ باتیں بھی مانتے اور کرتے ہیں جو ایمان کے بالکل منافی ہیں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ ذرا ان مدعیانِ علم سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے کس کا اور کس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کے الفاظ میں ان کے تضادِ فکر پر ایک قسم کی تعریض ہے اس لیے کہ جو علم متضاد افکار کا مجموعہ ہو وہ علم نہیں بلکہ جہل اور شدید قسم کا جہل ہے۔ فرمایا کہ تمہارے اس سوال کا جواب تو بہرحال وہ یہی دیں گے کہ یہ ساری چیزیں اللہ ہی کی اور اللہ ہی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ پھر ان سے کہو کہ 'اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ' اپنے اسی مسلمہ کی روشنی میں تم آخر اپنے افکار و عقائد کا جائزہ کیوں نہیں لیتے! اس کے بعد تم توحید کا کس طرح انکار کرتے ہو؟ یہ شرکا و شفعاء تم نے کہاں سے گھڑ لیے؟ قیامت تمھیں کیوں ایک عجیب چیز معلوم ہوتی ہے اور رسول کی دعوت سے تم اس طرح کیوں بدکتے ہو!!

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۸۶-۸۷)

فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم کا خداوند کون ہے؟ اوپر کا سوال زمین اور اہلِ زمین سے متعلق تھا، یہ سوال ساتوں آسمان اور عرش عظیم سے متعلق ہے۔ 'عرشِ عظیم' اللہ تعالیٰ کے ہمہ گیر اقتدارِ مطلق کی تعبیر ہے۔ اہلِ عرب جس طرح زمین کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے اسی طرح ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ وہ دنیا کی دوسری مشرک قوموں کی طرح آسمانوں اور زمین کے الگ دیوتاؤں کے قائل نہیں تھے۔ فرمایا کہ وہ تمہارے اس سوال کا جواب بھی یہی دیں گے کہ یہ ساری چیزیں اللہ ہی کی اور اسی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ چونکہ 'مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ' کے سوال کا اصل مطلب یہ ہے کہ ان میں خدائی کس کی ہے اس وجہ سے اس کے جواب میں 'لِلّٰهِ' بالکل موزوں ہے۔ فرمایا کہ اگر وہ تمہارے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیتے ہیں تو پھر ان سے پوچھو کہ تم ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کے مالک

سے ڈرتے نہیں کہ اس کی خدائی میں دھاندلی مچاتے، اس کے احکام و قوانین کی خلاف ورزی کرتے اور دوسروں کو بلا کسی استحقاق کے اس کی خدائی میں شریک بناتے ہو! اگر اس کا قہر و غضب تم پر نازل ہو جائے تو آخر کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (۸۸ - ۸۹)

'ملکوت' سے مراد — 'مَلَكُوْتُ' یہاں زمامِ اختیار و اقتدار کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ وہ تو جس کو چاہے پناہ دے سکتا ہے لیکن کسی دوسرے کی یہ شان نہیں ہے کہ اس کی پکڑ سے کسی کو چھڑا سکے؟ فرمایا کہ اس کا جواب بھی لامحالہ وہ یہی دیں گے کہ یہ سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ مشرکینِ عرب جن معبودوں کو پوجتے تھے ان کے متعلق ان کا یہ تصور نہیں تھا کہ وہ ایسا اختیار و اقتدار رکھتے ہیں کہ اپنے زور و اقتدار سے وہ کسی کو خدا کی پکڑ سے بچا سکیں بلکہ وہ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر ان کی پوجا محض اس امید پر کرتے تھے کہ یہ راضی رہیں تو ان کے طفیل میں خدا ان سے راضی رہے گا۔ اس سوال کے ساتھ بھی 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کے الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے جو میتھالوجی تیار کی ہے اس میں تو تم نے یہ درجہ کسی کو نہیں دیا لیکن اگر کوئی ہے اور تم اس کو جانتے اور مانتے ہو تو ذرا اس کا نام لو۔ پھر فرمایا کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار نہیں مانتے تو ان سے پوچھو کہ کس نے تم پر افسوں پھونکا ہے کہ بالکل تمہاری مت ماری گئی ہے اور تم خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی جے پکارتے ہو۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ ۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۹۰ - ۹۲)

مذکورہ بالا سوال و جواب پر استدراک — اب اس سارے سوال و جواب پر استدراک ہے کہ یہ جو کچھ مانتے ہیں یہ خود ان کے اپنے اعترافات کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ہم نے اس قرآن میں جو کچھ پیش کیا ہے یہ حق ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں اس لیے کہ یہ خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ خدا نے نہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے، نہ کسی کو اپنی بیٹی اور نہ کوئی اس کا ساجھی اور شریک ہے۔ اگر اس کائنات کی تخلیق میں اور الٰہ بھی شریک ہوتے تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا اور یہ سارا نظام کب کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ اس طرح کی خرافات جو یہ بیان کرتے ہیں یہ خدا کی اعلیٰ صفات کے بالکل منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام غائب و حاضر کا خود علم رکھنے والا ہے تو اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔ وہ ان چیزوں سے برتر ہے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

یونانیوں اور ہندوؤں کی میتھالوجی میں ان کے دیوتاؤں کی جو خوں ریز جنگیں مذکور ہیں یہاں ان پر بھی نظر رہے اور قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ بھی نگاہ میں رہے کہ مرد کو سورج نے پیدا کیا ہے اور عورت کو زمین نے۔ غور کیجیے کہ اگر سورج اپنے پیدا کیے ہوئے مردوں کو لے کر الگ ہو جاتے تو زمین کی عورتوں کا کیا حشر ہوگا! قرآن نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کارخانۂ کائنات قائم ہی اس وجہ سے ہے کہ اس میں ایک ہی خالق و مالک کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر اس میں دوسرے الٰہ بھی شریک ہوتے تو اس کا قیام و بقا ناممکن تھا۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ———— آیات ۹۳-۱۱۸

خاتمۂ سورہ آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے کہ اب فتح و نصرت کا وقت قریب ہے۔ اہل ایمان کامیاب و فتح مند اور آپ کے مخالفین دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی سے دوچار ہوں گے تو کچھ عرصہ ان کی شرارتوں سے درگزر کرو۔ فیصلہ کی گھڑی سر پر آگئی ہے۔ جس مدت کو یہ بہت طویل سمجھ رہے ہیں اور جس کے دھوکے میں اپنی شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے ہیں، انجام سامنے آجانے کے بعد محسوس کریں گے کہ وہ پلک جھپکتے گزر گئی اور اس وقت اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ
۹۳-۱۱۸ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ
اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ
يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾
لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ
وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ
بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۤئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۤئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا

كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ
اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾
اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَ
اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ
وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ
الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا
يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ
اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا
لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ
الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ
بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ
اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع ۶ ۱۷ ۶

ترجمۂ آیات ۹۳-۱۱۸

دعا کرو کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے وہ عذاب دکھائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا
ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو۔ اور بے شک ہم اس بات پر
قادر ہیں کہ جس عذاب سے ہم ان کو ڈرا رہے ہیں وہ تم کو دکھاویں۔ ۹۳-۹۵

ان کی شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو، یہ جو کچھ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں ہم اس
سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور دعا کرتے رہو کہ اے رب میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پنا

مانگتا ہوں۔ اور اے میرے رب اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔ ۹۶-۹۸

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ اے رب مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں! ہرگز نہیں! یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہنے والا بنے گا اور آگے ان کے ایک پردہ ہوگا اس دن تک کے لیے جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔ تو جب صُور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ آپس کا نسب کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے طالب مدد ہوں گے۔ پس جن کے پلّے بھاری ہوں گے وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلّے ہلکے ہوں گے تو وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ان کے چہروں کو آگ جھلسے گی اور اس میں ان کے منہ بگڑے ہوئے ہوں گے۔ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں تو تم ان کو جھٹلاتے تھے! کہیں گے اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب رہی اور ہم گمراہی میں پڑے رہے۔ اے ہمارے رب ہمیں اس جہنم سے ایک مرتبہ نکال، اگر ہم پھر ایسا کریں تو بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے۔ حکم ہوگا، دفع ہو، اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ میرے بندوں کی ایک جماعت ان لوگوں کی تھی جو دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے تو تم نے ان کو مذاق بنایا، یہاں تک کہ ان کے ساتھ تمھارے اس شغل نے تم کو میری یاد سے غافل رکھا اور تم ان کی ہنسی اڑاتے رہے۔ آج میں نے ان کی استقامت کا صلہ دیا کہ وہی کامیاب ہونے والے بنے۔ ۹۹-۱۱۱

کہنے والا کہے گا، سالوں کے حساب سے زمین میں کتنی مدت رہے ہوگے! کہیں گے ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصّہ، یہ بات شمار کرنے والوں سے پوچھو۔ کہنے والا کہے گا تم تو بس تھوڑی

ہی مدت رہے۔ کاش تم اس بات کو جانتے ہوتے! ۱۱۲-۱۱۴

تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بس یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے! تو بڑی ہی برتر ذات ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی کی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عرشِ کریم کا مالک۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو بھی پکارے گا، جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا اور کافر فلاح نہیں پائیں گے اور دعا کرو کہ اے رب! مجھے بخش اور مجھ پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۵-۱۱۸

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِیَنِّیْ مَا یُوْعَدُوْنَ ۝ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِیْ فِی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۹۳-۹۴)

وعدۂ عذاب کے باب میں پیغمبر کو بشارت

رسول کی تکذیب کی صورت میں قوم پر جو عذاب آیا کرتا ہے، قریش کے متکبرین کو جب اس سے ڈرایا جاتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں ہے۔ وَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ۔ ۴۶ (اور یا تو ہم تمھیں دکھا دیں گے اس عذاب کا کچھ حصہ یا تم کو وفات دیں گے اور ان کی واپسی ہماری ہی طرف ہوگی) اسی طرح سورۂ رعد میں فرمایا ہے۔ وَاِنْ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ۔ ۴۰ (اور یا تو ہم اس عذاب کا کچھ حصہ تم کو دکھا دیں گے جس سے ان کو آگاہ کر رہے ہیں یا تم کو وفات دیں گے اور تمھارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، محاسبہ ہمارے ذمہ ہے) بعینہٖ یہی مضمون سورۂ غافر کی آیت ۷۷ میں بھی ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک مکذبین کے لیے وعدۂ عذاب کا تعلق ہے وہ تو قطعی ہے۔ رہا اس کے ظہور کا وقت کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے گا یا آپؐ کی وفات کے بعد تو اس سوال کے جواب کو ان آیات میں مبہم چھوڑ دیا گیا تھا لیکن آیت زیرِ بحث اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے غلبہ و نصرت کے ظہور کا وقت اب بالکل قریب ہے، یہ بات آپؐ کی حیاتِ مبارک ہی میں واقع ہوگی اور اس کا لازمی نتیجہ آپؐ کے دشمنوں کی ہلاکت بھی ہے۔ یہ اشارہ یوں نکلتا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا تلقین کی گئی ہے کہ دعا کرو کہ اے رب اگر تو اس عذاب کو میری زندگی ہی میں ان ظالموں پر لانے والا ہے جس سے ان کو

ڈرایا جاتا رہا ہے تو مجھے اپنے دامنِ رحمت کے نیچے رکھیو، ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو۔ اس دعا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو بشارت اور آپ کے مکذبین کے لیے جو آخری انذار ہے وہ بالکل واضح ہے اور یہ امرِ واقعہ بھی ہے کہ آپ کے اعداء آپ کی زندگی ہی میں پامال ہو گئے اور آپ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا اعلان کر کے تشریف لے گئے۔

وَإِنَّا عَلَىٰٓ أَن نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَٰدِرُونَ (۹۵)

ناسازگار حالات کے علی الرغم اللہ کا وعدہ پورا ہوگا

یہ اسی بشارت کو، جو اوپر والی آیت میں مضمر ہے، مؤکد فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اس دور میں ابھی حالات بہت ناسازگار تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ معاندین کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر مکہ سے ہجرت پر مجبور ہو رہے تھے۔ یہ باور کرنا کچھ آسان نہیں تھا کہ اسی تاریکی کے اندر سے عنقریب روشنی پیدا ہونے والی ہے۔ اس تردد کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس بات پر پوری طرح قادر ہیں کہ تمہاری زندگی ہی میں تمہارے دشمنوں کو پامال کر دیں۔ حالات ہمارے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتے!

ہجرت کی طرف اشارہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین صرف اس عذاب کی شدت کو نہیں ظاہر کر رہی ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اے رب اگر یہ عذاب میری زندگی ہی میں آنے والا ہے تو اس کے آنے سے پہلے پہلے میری اور میرے باایمان ساتھیوں کی نجات کی راہ کھول۔ گویا دعا کے اسلوب میں آپ کو یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ اس عذاب سے محفوظ رکھنے کا سامان آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے کر لیا ہے۔

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ (۹۶)

عفو و درگزر کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور عفو و درگزر کی تلقین ہے کہ ان کے برے سلوک کا جواب بدستور اپنے اچھے سلوک سے دیتے رہو۔ جو ہرزہ سرائیاں اور بدتمیزیاں یہ کر رہے ہیں ہم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ایک ایک شرارت کا مزہ ہم ان کو چکھائیں گے، تم ان کے رویے سے دل گرفتہ نہ ہو۔ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑو۔ اب فیصلہ کا وقت قریب ہے۔

وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَٰتِ الشَّيَٰطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ (۹۷-۹۸)

حصولِ صبر و عفو و درگزر کی دعا

یہ حصولِ صبر و عفو و درگزر کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے۔ 'شیطان' سے مراد شیاطین جن بھی ہیں جو دلوں میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور وہ شیاطین انس بھی جن کا رویہ یہاں زیرِ بحث ہے۔ فرمایا کہ برابر یہ دعا کرتے رہو کہ اے رب مجھے شیاطین جن کے وسوسوں سے بھی محفوظ رکھ اور ان شیاطین انس سے بھی محفوظ رکھ کہ وہ میرے پاس بحث و جدال اور شر و فساد کے لیے نہ آئیں۔

حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّيٓ أَعْمَلُ صَٰلِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّآ ۚ إِنَّهَا
كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۖ وَمِن وَرَآئِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۹۹-۱۰۰)

کفار کی بعد از وقتِ حسرت

یعنی یہ لوگ اپنی ان شرارتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آدھمکے گی اور اس عالم کے احوال و معاملات سے سابقہ پیش آئے گا تب ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ اس وقت بڑی لجاجت سے درخواست کریں گے کہ اے رب! مجھے ایک بار دنیا میں پھر جانے دے تاکہ جو مال و متاعِ وہاں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں جاکر کچھ نیکی کما لوں۔ کَلَّا اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَآئِلُھَا، فرمایا کہ یہ بات ہرگز ہونے والی نہیں ہے، بس یہ ایک بات ہوگی جو بڑی حسرت کے ساتھ وہ کہے گا لیکن اس کی اس حسرت کے پورے ہونے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ عمل کی مہلت بس اس دنیا کی زندگی تک ہے۔ اس مہلتِ حیات کے ختم ہونے کے بعد ان کے آگے ایک پردہ ہوگا جو اسی دن اٹھے گا جس دن وہ حساب و کتاب کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ اس ٹکڑے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بات وہ کہنے کو تو کہے گا لیکن اگر اس کو دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تو وہ کرے گا وہی جو کرتا رہا ہے۔ قرآن میں اس مفہوم کے لیے نظیر موجود ہے لیکن یہاں ہمارے نزدیک وہی مفہوم ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اس کے نہایت واضح نظائر آخری گروپ کی سورتوں میں موجود ہیں۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ (۱۰۱)

قیامت کے دن کی نفسی نفسی

یہ قیامت کے دن کی نفسی نفسی کی تصویر ہے کہ اس دن نہ کسی کا نسب کچھ کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہی ہو سکیں گے۔ 'تَسَآءُلٌ' کے معنی آپس میں ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہونا ہے۔ مصیبت کے وقت میں نسبی و خاندانی عصبیت اور قومی و قبائلی تعاضد و تناصر اس دنیا میں بڑا سہارا ہے اور عرب میں اس چیز کو خاص طور پر بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں اپنے خاندان یا قبیلہ کی دہائی پکار دیتا تو اس کے قبیلہ کا ہر شخص اس کی حمایت میں کٹ مرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ فرمایا کہ صور پھونکے جانے کے بعد سارے نسب ختم ہو جائیں گے اور کوئی ایک دوسرے سے نہ طالبِ مدد ہو سکے گا اور نہ کوئی کسی کی مدد کر سکے گا۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فِیْ جَھَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ تَلْفَحُ وُجُوْھَھُمُ النَّارُ وَھُمْ فِیْھَا کٰلِحُوْنَ (۱۰۲-۱۰۴)

اس دن کسی کا حسب نسب کچھ کام نہیں آئے گا بلکہ صرف اس کا عمل کام آئے گا۔ جن کے پلے بھاری ہوں گے وہ تو کامیاب ہوں گے اور جن کے پلے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا، وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں پڑے رہیں گے۔ اس جہنم میں ان کا حال یہ ہوگا کہ آگ ان کے چہروں کو جھلسے گی اور وہ منہ بسورے ہوئے ہوں گے۔

اَلَمْ تَکُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَکُنْتُمْ بِھَا تُکَذِّبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَکُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْھَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ (۱۰۵-۱۰۷)

کفار کی فریاد اور اس کا جواب

یعنی جب وہ چیخیں چلائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملے گا کہ اب کیوں روتے چلاتے

ہو، اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے جب تم کو ہماری آیتیں سنائی جاتی تھیں تب تو تم ان کی تکذیب کرتے تھے! وہ اعتراف کریں گے کہ اے رب! یہ ہماری بدبختی اور شقاوت تھی جو ہم پر چھائی رہی کہ ہم نے اس دن کی تکذیب کی، بلاشبہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں لیکن اے ہمارے رب، ایک بار اور ہمیں موقع دے۔ اگر پھر ہم یہی کچھ کریں تو لاریب ہم اسی کے سزاوار ہیں۔

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ (۱۰۸)

لفظ 'خَسَأَ' کتے کو دھتکارنے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اس التجا کا یہ جواب ملے گا کہ چلو دفع ہو! اسی میں پڑے رہو اور اب مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۚۖ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ۔ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۱۰۹ - ۱۱۱)

غربائے مسلمین کی دلداری

یہ اس غیرت کا بیان ہے جس کے سبب سے خدا نے غیور ان اشقیاء کو بات کرنے سے روک دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تم میرے آگے زبان نہ کھولو، تم وہ شقی اور بدبخت لوگ ہو کہ جب میرے بندوں کی ایک جماعت میرے آگے 'رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ' کی دعا کرتی تھی تو تم نے ان کو مذاق بنا رکھا تھا اور اس شغل مذاق میں اس طرح تم منہمک رہے کہ تمھیں یہ بات یاد بھی نہ رہی کہ کبھی مجھ سے بھی تمھیں سابقہ پڑنے والا ہے اور تم پوری جسارت کے ساتھ ان کی ہنسی اڑاتے رہے تو آج میں نے ان کی صبر و استقامت کا ان کو صلہ دیا، اب وہ فائز المرام ہیں اور تم یہ بھاڑ جھونکو اور اسی میں جلو!

'فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ' میں لفظ 'فریق' اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں اس سے مراد خاص طور پر غربائے مسلمین ہیں جو اپنی غریبی اور بے کسی کے سبب سے متمردین قریش کے ظلم و ستم اور ان کے مذاق و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ وہ تو ہم سے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے تھے اور تم ان کی دعا اور نماز کو اپنی رعونت کے سبب سے ایک شغل تفریح بنائے ہوئے تھے۔ 'سِخْرِيٌّ' اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس کو ایک اضحوکہ اور مذاق بنایا جائے۔ کسی کو مذاق بنانا بجائے خود ایک بہت بڑی رعونت ہے اور یہ رعونت وہ چند ہو جاتی ہے اگر کوئی شقی اس کی دعا اور نماز کا مذاق اڑائے اس لیے کہ اس صورت میں وہ صرف اسی کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ خود خدا کا بھی مذاق اڑاتا ہے۔

'حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ' یعنی اس شغل تفریح میں تم ایسے منہمک رہے کہ کبھی تمھیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ کوئی تمھارا خدا بھی ہے جو تمھاری ان حرکتوں کو، جو تم اس کے ذاکر و شاغل اور صابر و شاکر بندوں کے ساتھ کر رہے ہو، دیکھ رہا ہے اور ایک دن وہ ضرور ان میں سے ایک ایک چیز کا انتقام لے گا۔

'اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ' یعنی اب آنکھیں کھول کر دیکھ لو، وہ چیز تمھارے سامنے موجود ہے جس کو تم نے بھلائے رکھا۔ تمھارے تمام ظلم و ستم اور مذاق و تمسخر کے علی الرغم میرے جو بندے

میری بندگی پر جمے رہے میں نے آج ان کو ان کی استقامت کا بھرپور صلہ دے دیا۔ ' اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ' یہ اس صلہ کی تفصیل ہے کہ وہی کامیاب ہونے والے بنے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ ان کا مذاق اڑانے والے نامراد ہوئے۔ یہاں اس سورہ کی پہلی آیت ' قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ' کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ جس بات سے سورہ کا آغاز ہوا تھا اب اسی پر سورہ کا اختتام ہو رہا ہے۔ یہ عود علی البدء کا اسلوب قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے اور نظمِ قرآن کے نہایت واضح دلائل میں سے ہے۔

غور کیجیے، ان آیات کا ان غربائے مسلمین پر کیا اثر پڑا ہو گا جو اس دور میں متکبرین کے ظلم اور استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے ان کے صبر و عزیمت کو ربِ غیور کی اس دلداری سے کتنی غذا اور قوت حاصل ہوئی ہو گی!

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱۲-۱۱۴)

طولِ حیات کا مغالطہ

اب یہ واضح فرمایا کہ ظہورِ قیامت کو یہ جو بہت بعید چیز سمجھے ہوئے اس مغالطہ میں ہیں کہ اگر وہ آئی بھی تو اس کے آنے میں اتنی دیر ہے کہ ابھی سے اس کی فکر میں اپنا عیش مکدر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ مغالطہ بہت جلد دور ہو جائے گا۔ نفخِ صور کے بعد جب یہ اٹھیں گے تو ان کو محسوس ہو گا کہ جس زندگی کو وہ بہت طویل سمجھے ہوئے تھے وہ پلک جھپکتے ختم ہو گئی۔

' قٰلَ ' کا فاعل یہاں اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ ' قَالَ قَآئِلٌ ' کے مفہوم میں ہے۔ یعنی قیامت کو جب یہ اٹھیں گے تو انھیں میں سے کوئی پوچھنے والا پوچھے گا کہ بھلا بتاؤ، دنیا میں ہم کتنی مدت رہے ہوں گے؟ دوسرے جواب دیں گے کہ بس ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم۔ ' فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ' یہ جواب دینے والوں کی طرف سے بیزاری کا اظہار ہو گا کہ بھلا کسی کو کیا پتہ کہ ہم دنیا میں کتنے دن رہے، اگر کسی نے اس کا شمار رکھا ہو تو اس سے جا کے پوچھو! یعنی آج جس زندگی کے طول اور اس کے عیش پر ریجھے ہوئے ہیں، ایک دن آنے والا ہے جب اس کے متعلق کوئی سوال بھی طبیعت پر نہایت گراں گزرے گا۔ ' قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ' یہ بھی انہی میں سے کسی کی بات ہو گی جس میں کچھ ملامت و حسرت کا مفہوم بھی ہے، یعنی دنیا میں تم رہے تو بہت کم لیکن اس کو جاننے اور سمجھنے کا وقت وہ تھا جب تم دنیا میں تھے، اب تو اس کا وقت گزر چکا ہے۔

یہی مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۰۲-۱۰۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں یہ تصریح ہے کہ یہ باتیں انہی کے درمیان آپس میں ہوں گی۔ ' يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ' (وہ آپس میں سرگوشی کریں گے کہ بس تم ایک عشرہ دنیا میں رہے ہو گے!) اسی سلسلہ میں ان کے سب سے زیادہ دانا و بینا کی یہ بات بھی نقل ہوئی ہے کہ ' اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ' (جب کہ ان میں جو سب سے زیادہ ہوش و گوش والا ہو گا کہے گا کہ بس تم ایک دن دنیا میں رہے ہو گے!) میرے نزدیک آیاتِ زیرِ بحث میں بھی آخری قول ان کے ' اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً ' کا نقل ہوا ہے۔

سورۂ کہف آیت ۱۹ میں اصحابِ کہف کا طویل نیند سے اٹھنے کے بعد جو مکالمہ مذکور ہوا ہے اور جو درحقیقت مثال ہے عالمِ برزخ کے بعد کی زندگی کی، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب ان کے اپنے ہی درمیان ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے، جس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ غفلت کی زندگی کا سارا طول و عرض صرف اس وقت تک محسوس ہوتا ہے جب تک وہ حاصل رہتی ہے، جب گزر جاتی ہے تو بس ایک خواب معلوم ہوتی ہے!

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ (۱۱۵)

جزاء و سزا صفاتِ الٰہی کا لازمی تقاضا ہے

یعنی اگر تم جزا و سزا سے بے پروا بیٹھے ہو تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم اسی طرح شترِ بے مہار چھوٹے پھرو گے اور ایک دن مر جاؤ گے اور تمہاری واپسی ہماری طرف نہیں ہونی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے یہ سمجھا ہے تو تم نے بہت ہی غلط سمجھا ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ (۱۱۶)

یہ اپنی صفات کی یاد دہانی فرمائی ہے جس سے مقصود اس مغالطہ کی تردید ہے جس میں جزا و سزا کے یہ منکرین مبتلا تھے۔ فرمایا کہ خدا کی ذات بہت ہی بلند و برتر ہے۔ اس بلند و برتر ہستی کی شان سے یہ بات نہایت بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے اور محض کھیل تماشہ کے طور پر ایک پورا جہان پیدا کر ڈالے۔ وہ 'اَلۡمَلِكُ الۡحَقُّ' یعنی اس کائنات کا بادشاہِ حقیقی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی رعیت کے درمیان عدل و انصاف نہ کرے اور ظالم و مظلوم دونوں کو یکساں کر دے۔ 'لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ' یعنی اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے تو کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ اس کی پکڑ سے وہ کسی دوسرے کی سعی و سفارش سے اپنے کو بچا لے جائے گا۔ 'رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ' عرش، خدا کی حکومت کی تعبیر ہے اور لفظ 'کریم' قرآن میں باعزت اور بافیض کے معنی میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ایک باعزت اور بافیض عرش کا خداوند ہے تو اس کی حکومت ایک اندھیر نگری کس طرح ہو سکتی ہے!

وَمَنۡ يَّدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡكٰفِرُوۡنَ (۱۱۷)

یہ اوپر والے توحید کے مضمون کی مزید وضاحت فرما دی کہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی اس کی عبادت میں شریک کرے گا، جب کہ کسی شریک کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، تو وہ یاد رکھے کہ خدا کے آگے اس کو ایک دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ اور یہ امر بھی وہ یاد رکھے کہ جو لوگ خدا کا کسی کو شریک ٹھہرائیں گے وہ کافر ہیں اور کافر فلاح نہیں پائیں گے۔ 'قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ' سے یہ سورہ شروع ہوئی تھی اور 'لَا يُفۡلِحُ الۡكٰفِرُوۡنَ' پر ختم ہوگئی۔

وَقُلْ رَّبِّ اغۡفِرۡ وَارۡحَمۡ وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰحِمِيۡنَ (۱۱۸)

دعا کے پیرایہ میں اہل ایمان کے لیے نصرت کی بشارت

یہ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے ساتھیوں کو طلبِ مغفرت و رحمت کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دعا وہی ہے جس کا حوالہ آیت ۱۰۹ میں گزر چکا ہے اور جس کا متکبرین مذاق اڑاتے تھے۔ اس دعا کی تلقین سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنے اسی موقف پر ڈٹے رہو اور

یہی دعا کرتے رہو۔ یہی تمہارے لیے مغفرت و رحمت کے دروازے کی کلید ہے۔ یہ دعا کے اسلوب میں اہل ایمان کے لیے فتح و نصرت کے ظہور کی بشارت ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ اللّٰھم اغفر وارحم وانت خیر الرّٰحمین۔

رحمان آباد

۱۰ر اگست ۱۹۷۳ء